ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۲۶ اگست - ۲ ستمبر ۱۹۷۱ء

تو قادر و عادل ہے
مگر تیرے جہاں میں!!!

اقبال

قیمت :- ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ۷۵ پیسے

کشور ناھید

زمانہ ساز طبیعت کی چاشنی نکلے
ہنسو کہ ہونٹوں پہ زخموں کی دِلکشی نِکلے

کبھی تو صُبح نما ہو فسانۂ شب زاد
کبھی تو حیلۂ غم سے بھی زِندگی نِکلے

قرارِ جاں ہے جوع، نام بھی تو لو اُس کا
سکوُتِ لب میں نہاں سحرِ سامری نِکلے

مرا حریف مجھے آئینہ دکھا نہ سکے
سزائے جُرم، سزاوارِ عاشقی نِکلے

ہوائیں نوحہ کُناں ہیں مِری تباھی پر
سحر کے سارے پیامی غنیم ھی نِکلے.

ھزار ابرِ تعلق گھِرا برس نہ سکا
نشاطِ قُرب کے رستے نمائشی نِکلے

شفق کا رنگ گھُلا، نالیوں کے پانی میں
بس اب تو سیلِ بلا، مِشلِ آگہی نِکلے

گریزِ شب سے ٹلے گی نہ شب کی تاریکی
دُعا کے دام سے اب عزمِ راہبری نِکلے

الفتح
کراچی

خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد:— ۲ شمارہ:— ۱۵

۲۶ر اگست - ۲ر ستمبر ۱۹۷۱ء

نگرانے
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونینے خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدّیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۶۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درہم
سعودی عرب :- ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۷۸ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
بلاک ۲ ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر، ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

مرا/ضا

ادار یہ

ملوں میں مزدوروں کی چھانٹی

پی پی آئی کی اطلاع کے مطابق کراچی کے کئی ٹیکسٹائل ملوں میں جزوی کام بند ہونے کے باعث سینکڑوں مزدوروں کو برطرف کیا جارہا ہے۔ اس سے پہلے مُلک کے دُوسرے حصّوں سے بھی بعض کارخانوں سے مزدوروں کی چھانٹی کی خبریں ملی ہیں۔ اس کے لیے سرمایہ دار وہی پرانے حیلے تراش رہے ہیں جس میں خام کپاس کی مہنگائی، مسلسل نقصان، پیداوار پر زیادہ اخراجات کے بہانے شامل ہیں۔ بعض کارخانے داروں نے اس میں ڈالر کی تازہ ترین صورتِ حال سے پڑنے والے بین الاقوامی مالیاتی دباؤ کو بھی سبب ٹھہرایا ہے۔ سارا نزلہ عضوِ ضعیف یعنی مزدور پر گر رہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سارے اسباب کا ذمہ دار کون ہے؟ قصور کس کا ہے؟ سزا کس کو مل رہی ہے؟ مزدور تو اپنی محنت فروخت کرتا ہے۔ اگر خام کپاس سستی ہو۔ نفع ہو رہا ہو، بین الاقوامی مالیاتی دباؤ نہ ہو تو اس سے کارخانہ دار کے نفع میں تو اضافہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو آسودہ حال ہو سکتا ہے۔ لیکن مزدور کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب مزدور کو نفع میں شریک نہیں کیا جاسکتا تو نقصان کی صورت میں اسے کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کارخانے دار کی تو صرف نفع ہی کچھ شرح کم ہوتی ہے مگر مزدور کا تو روزگار ہی ختم ہوگیا۔ سینکڑوں مزدور بے روزگار نہیں ہوتے۔ سینکڑوں خاندان بھوکے ہوگئے۔ سینکڑوں خاندان ننگے ہوگئے۔ سینکڑوں بچے تعلیم سے محروم ہوگئے۔ سینکڑوں چولہے سرد ہو گئے۔ سینکڑوں پیٹ خالی ہوگئے۔

کارخانے دار کو اس وقت جو کچھ میسّر ہے، وہ سب انہی مزدوروں کی محنت کا پھل ہے۔ ذرا سے حالات خراب ہوتے پر اپنے ان محسنوں کو یوں برطرف کردینا احسان فراموشی ہے۔

صدرِ مملکت اپنی ۲۸ر جون کی نشری تقریر میں تالے بندیوں اور ہڑتالوں دونوں کو موجودہ صورتِ حال میں وطن دشمنی کے مترادف قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے موجودہ حکومت کے متعلقہ حکام کو چاہیئے کہ وہ فوری طور پر دیکھیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بڑھتا رہا اور مزدوروں کو یوں روزگار سے محروم کیا جاتا رہا تو اس سے جہاں "پیداوار" پر اثر پڑے گا، غیر ملکی طاقتوں کے رویّے کے پیشِ نظر ہمیں جس طرح اب خود کفالت کی ضرورت ہے وہ بھی پوری نہ ہوگی اور بے روزگار افراد کی تعداد بڑھ جانے سے بے چینی اور اضطراب بھی پھیلے گا۔ جس کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہوتے۔ اس لئے ابھی سے معاملہ کو سنبھال لینا ضروری ہے۔

سرورق پر شائع ہونے والی لاطینی امریکہ کے ایک ملک کی تصویر
مغربی سامراج کی بربریت اور ظلم کی ایک منہ بولتی تصویر۔

میرے ویر تم ہی بولو، میری چادر اُتر چکی ہے

سامع

ماں! آنکھیں کھولو۔

ماں! دھرتی کا رنگ دیکھو۔ لال ہو رہا ہے۔

"ہاں۔ ہاں۔ میرے بابل کے خون کی لالی اس میں مل چکی ہے۔"

"مجھے چھوڑ دو۔ میری چادر نہ کھینچو۔ مجھے چھوڑ دو، میرے گبھرو ویر کے لہو نے تیری دھرتی کو سہاگن بنا دیا ہے۔"

ماں! تم چپ کیوں ہو؟

بابل۔ جواب دو۔

میرے ویر تم ہی بولو، میری چادر اُتر چکی، میرے کپڑے پھٹ چکے، میں ننگی ہو گئی۔ میں قربان ہو گئی۔

اے ان دیکھی سرزمینِ پاک! یہ ستارے، یہ ہوائیں، تمھیں گواہی دیں گی کہ مجھ جیسی ہزاروں معصوم بیٹیاں راہِ وفا کے گمنام مسافروں کی کھیپ میں ننگی ہو گئیں، قربان ہو گئیں کہ شاید ۱۴ اگست کو ہر سال کوئی ماں، کوئی بابل، کوئی ویر میری چادر پھر اُترنے نہ دے، میرے کپڑے پھر پھٹنے نہ دے، مجھے پھر ننگا ہونے نہ دے"۔

سنو! یہ آواز اب بھی آ رہی ہے۔

سنو! ہر سال ۱۴ اگست کو جب دیئے جھلملاتے ہیں۔ تو ان کی لوئیں سے یہ آواز — اب بھی سرسراتی ہے

یہ روشنی، یہ لو، خون کے جن سوتوں سے پھوٹی تھی۔ انھیں کیا ہوا۔

ماں، بابل اور ویران چمکتے رنگوں میں لہو کی رنگت کیوں تحلیل ہو بیٹھے۔ کیا یہ اُن کا اپنا لہو نہیں تھا؟

کیا یہ اُن کا لہو نہیں تھا جن کا کوئی نام نہیں تھا۔

جن کی کوئی ذات نہیں تھی۔
جن کی کوئی نسل نہیں تھی۔
جن کا کوئی رنگ نہیں تھا۔
مگر
جن کی لگن ایک، یقین ایک، ایمان ایک تھا۔

وہ پا پیادہ، لٹے پٹے، تن برہنہ، چلچلاتی دھوپ کے وار سہتے، کٹھن راستے طے کرتے، پاک سرزمین تک پہنچنے کے لئے خون کے دریا عبور کر گئے۔

کیا انھیں اس لئے بھلا دیا گیا کہ سمندر کی لہروں نے ان کی منزل تک پذیرائی نہیں کی تھی؟"

کہ وہ امنگوں، قربانیوں اور حوصلوں کے دوش پر سینہ سپر آتے، ہوا کے دوش پر نہیں آ سکتے تھے۔

سنو! اے راہروانِ دوشِ آب و ہوا
اس آواز کو غور سے سنو۔

ہزاروں معصوم بیٹیاں
راہِ وفا کے گمنام مسافروں کی
کھیپ میں ننگی ہو گئیں
قربان ہو گئیں

سنو! شاید یہ آواز تمہارے ضمیر سے بھی آ رہی ہو — !

لیکن تمہارا ضمیر، تمہاری خود غرضیوں، خود پسندیوں، خود آسائشیوں اور خود نمائیوں کے کچوکے ۲۴ سال تک سہتا رہا۔ اور ایک دن تم نے اسکو تج کر روپ در روپ اپنایا، سامع نے راہزن راہبروں کی آواز پر پھر لبیک نہ کہی۔ کیوں کہ وہ جان چکا تھا کہ یہ سب ایک ہی روپ کے بہروپ ہیں۔ اور تب اس کے کانوں میں قریہ قریہ، شہر شہر کوئی شیرینی گھول رہا تھا۔ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
اور ہاں سنو!

تمہارا ضمیر تو مر چکا ہے۔ تمہارا خون تو منجمد ہو چکا ہے۔ اور تم ایک برفانی نسل بن چکے ہو جسے صرف مئے ناب ہی حرارت پہنچاتی ہے تاکہ تم کوئی چادر کھینچ سکو اور مجبوریوں کی برہنگی کا تماشا دیکھ سکو۔ تم نے شرفِ انسانیت کے درس کا بھی پاس نہ کیا۔

پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ

اور اس لہو کے امانت داروں نے اب کے پھر ۱۴ اگست کو ادغام کا جشنِ طرب رچانے کے لئے بہروپ کے ایک روپ میں انضمام کا انتظام و انصرام کیا۔ اس انضمام، اس ادغام کا تقاضا تمہیں وقت کے ایسے دوراہے پر لے آیا ہے جہاں حقارت و تحقیر تمہارا مقدر بن چکی ہے۔ یہ تو عمل کا وقت تھا۔ یہ تو فیصلے کی گھڑی تھا۔ تم نے یہ وقت، یہ گھڑی بھی کھو دی۔ تمہارا انتظام، تمہارا انصرام، تمہاری خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ تم وہ صیاد ہو جو اپنے ہی دام سے نکل نہ سکو۔

سنو! آواز آ رہی ہے۔

تم جس لہو کے امانت دار ہو، اس لہو والے تو شانے سے شانہ ملاتے ہیں۔ قدم سے قدم اور دل سے دل۔ یہ تو سیسہ پلائی دیوار بنتے ہیں جسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔

اس تعلق میں طاقت ہے جب تک
اس خوں میں حرارت ہے جب تک
بھرپور خزینہ ہمت کا"

چین اور اقوام متحدہ کے رکن ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہونے کا ایک جائزہ

۱۲۴ میں سے ۶۳ نے چین کو تسلیم کر لیا

وہاب صدیقی

شاہراہ ریشم کے کرشموں کا آغاز ہو چکا ہے۔ صدیوں پرانے تعلقات جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سامراجیوں کی رکاوٹوں اور تخریبی کارروائیوں کے نتیجے میں قائم نہ رہ سکے تھے، بحال ہو رہے ہیں۔ ترکی کے بعد ایران نے بھی عوامی جمہوریہ چین سے سفارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ اس طرح اقوام متحدہ میں

سوشلسٹ چین کو تسلیم کرنے والے ممالک کی تعداد ۶۳ ہو گئی ہے۔ خود امریکی سامراج عرصہ دراز سے چیانگ کائی شیک کے ناپاک اور گھناؤنے گٹھ جوڑ سے عوامی جمہوریہ چین پر اپنا پرچم لہرانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اب چینی عوام کی نمائندہ اور قانونی حکومت عوامی جمہوریہ چین کی طرف دوستی کا

اقوام متحدہ میں چین کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے

گذشتہ سالوں میں اقوام متحدہ میں عوامی جمہوریہ چین کو عالمی ادارے کا رکن بنانے کے لئے جنرل اسمبلی میں جو ووٹ ڈالے گئے

سال	چین کی حمایت میں ڈالے جانے والے ووٹ	امریکی سامراج کی اطاعت میں ڈالے جانے والے ووٹ	غیر جانبدار
۱۹۵۰ء	۱۰	۳۷	۸
۱۹۵۱ء	۱۱	۳۶	۴
۱۹۵۲ء	۷	۴۱	۱۱
۱۹۵۳ء	۱۰	۴۳	۲
۱۹۵۴ء	۱۱	۴۲	۶
۱۹۵۵ء	۱۲	۴۱	۶
۱۹۵۶ء	۲۴	۴۶	۸
۱۹۵۷ء	۲۷	۴۷	۶
۱۹۵۸ء	۲۸	۴۳	۹
۱۹۵۹ء	۲۹	۴۳	۹
۱۹۶۰ء	۳۴	۴۱	۲۲
۱۹۶۱ء	۳۷	۴۷	۱۹

سال	چین کی حمایت میں ڈالے جانے والے ووٹ	امریکی سامراج کی اطاعت میں ڈالے جانے والے ووٹ	غیر جانب دار
۱۹۶۲ء	۴۲	۵۵	۱۲
۱۹۶۳ء	۴۲	۵۶	۱۲
۱۹۶۵ء	۴۷	۴۶	۲۰
۱۹۶۶ء	۴۶	۵۶	۱۷
۱۹۶۷ء	۴۵	۵۸	۱۶
۱۹۶۸ء	۴۴	۵۷	۲۳
۱۹۶۹ء	۴۸	۴۵	۲۱
۱۹۷۰ء	۵۱	۴۸	۲۵

امریکی سامراج کی اطاعت میں عوامی جمہوریہ چین کی مخالفت میں ڈالے جانے والے ووٹوں میں فارموسا کا ووٹ شامل نہیں کیا گیا ہے جو چین کی نشست پر غیر قانونی طور پر قابض ہے۔

۱۹۶۴ء میں امریکی سامراج کی مخالفت کی بنا پر قرارداد کے مسودے پر بحث نہیں ہو سکی تھی۔

ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

چینی عوام نے چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے سرخ پرچم تلے برسوں کی مسلح جدوجہد کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کی بنیاد ڈالی۔ سوویت یونین نے سب سے پہلے عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کیا۔ اس سے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ مشرقی یورپ کی دیگر سوشلسٹ ریاستوں نے بھی فوراً ہی چین کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن امریکی سامراج اور اس کے حواری ممالک نے عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور چیانگ کائی شیک کی حکومت کو جو چین کے ایک مختصر سے ٹکڑے فارموسا تک محدود تھی، چینی عوام کی نمائندہ اور قانونی حکومت قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی سامراج عوامی جمہوریہ چین کو سوویت یونین کے زیر اثر سمجھتا تھا اور اسے امید تھی کہ چین سوویت یونین کے نقش قدم پر چلے گا۔ چنانچہ سامراج کی خارجہ پالیسی کا خالق جان فاسٹر ڈلس لکھتا ہے:

"چین کے ۴۵ کروڑ عوام ایک ایسی قیادت کی گود میں جا گرے ہیں جو امریکہ کی سخت دشمن ہے۔ اور اپنی رہنمائی اور راہ عمل ماسکو سے حاصل کرتی ہے۔ منچوریا، منگولیا اور سنکیانگ کے شمالی علاقوں پر سوویت یونین کا سیاسی کنٹرول ہے یہ علاقے معدنیات سے مالا مال ہیں۔ اگر سوویت یونین چینی عوام کی افرادی قوت کو بروئے کار لایا، جو وہ ان معدنی وسائل کی بدولت صنعتی اور معاشی میدان میں بڑی ترقی کر جائے گا اب سوویت کمیونزم کو جرمنی کے دریائے ایلبے سے لے کر چینی سمندر تک ستر کروڑ افراد اور لامحدود قدرتی معدنی وسائل سے افادہ کرنے کا موقع مل گیا ہے۔" (بحوالہ "جنگ یا امن" صد ۱۴۷)

امریکی سامراج پہلے ہی سوویت یونین کے

بڑھتے ہوئے اثرات اور اشتراکیت کی مقبولیت سے خائف تھا۔ اس نے "جمہوریت کی بقا اور حفاظت" "فرد کی آزادی" جیسی اصطلاحات کا سہارا لے کر فارموسا کو دھڑا دھڑ فوجی امداد دینی شروع کر دی۔ فوجی معاہدے بھی کئے۔ فارموسا کے فوجی معاہدے کے سامنے سیٹو اور سنٹو کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ امریکی سامراج نے نہ صرف فارموسا کو چین کی قانونی حکومت قرار دیا۔ بلکہ اُسے اقوام متحدہ کے "پانچ بڑوں" میں شامل کر کے عوامی جمہوریہ چین پر اقوام متحدہ کے دروازے بند کر دیئے۔ دراصل امریکہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ عوامی جمہوریہ چین کچھ مدت کے بعد ختم ہو جائے گا۔ عوام اشتراکیت اور چینی اشتراکی حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں گے۔ چنانچہ عوامی جمہوریہ چین کی اقوام متحدہ میں شمولیت کے بارے میں جان فاسٹر ڈلس لکھتا ہے:

"اگر کمیونسٹ چین کی حکومت اپنی حاکمیت منوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اقوام متحدہ میں نمائندگی اس کا حق بنتا ہے۔ مگر ایک حکومت جو خانہ جنگی کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ اُسے اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ایک مناسب مدت میں اپنے وجود کو تسلیم نہیں کروا لیتی۔"
(بحوالہ "جنگ یا امن" صفحہ ۱۹۰)

عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے تین ماہ بعد ہی برطانیہ، پاکستان اور کئی دیگر ممالک نے اسے تسلیم کر لیا۔ پاک چین تعلقات کی استواری میں ایک بڑے واقعہ نے اہم کردار انجام دیا۔ ۱۹۴۹ء میں برطانیہ نے اسٹرلنگ کی قیمت میں کمی کر دی۔ بھارت نے بھی اپنی کرنسی کی قیمت گرا دی۔ مگر پاکستان نے اپنے سکے کی قیمت میں کمی نہ کی۔ بھارت نے دباؤ ڈالا۔ لیکن پاکستان نے اپنے سکے کی قیمت گرانے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں پاکستان پٹ سن، کپاس ہندوستان کو برآمد کرتا تھا۔ پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار بھارت تھا۔ بھارت سے کوئلہ اور سوتی کپڑا منگوایا جاتا تھا۔ چنانچہ بھارت کے حکمرانوں نے پاکستان کو کوئلہ فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسے نازک وقت میں چین نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پٹ سن اور کپاس کے عوض بھاری تعداد میں پاکستان کو کوئلہ دے کر پاکستان کو بھارت کے ناجائز دباؤ سے نجات دلائی۔

اس واقعہ نے دنیا کے دیگر ترقی پذیر اور نو آباد ممالک کو چین سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب پاکستان سمیت دیگر ممالک نے بھی اقوام متحدہ میں سوشلسٹ چین کے داخلے کی کوششیں کیں۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جو وفد اس اسمبلی میں چین کی نمائندگی کر رہا ہے۔ کئی ماہ قبل چین کے وسیع علاقے پر سے اس کی حاکمیت ختم ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جنرل اسمبلی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتی۔ وجہ یہ نہیں کہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ بلکہ جنرل اسمبلی کی اکثریت اس حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتی۔"
(بحوالہ "پاکستان اور اقوام متحدہ" از کے۔ سرور حسن)

لیکن چین کی خارجہ پالیسی جو چیئرمین ماؤزے تنگ کے "پنچ شیلا" پر مبنی تھی۔ نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک میں مقبول ہوتی گئی۔ "پنچ شیلا" یہ ہیں۔ "ہمارا یہ پختہ موقف ہے کہ تمام اقوام کو پانچ مشہور اصولوں (پنچ شیلا) پر عمل کرنا چاہیئے۔ یعنی ایک دوسرے کی خود مختاری، علاقائی یکجہتی کا احترام، مساوات، باہمی اور مفاد اور پُرامن بقائے باہمی، یہی اقوام کے تعلقات کا معیار ہے۔" چنانچہ سوشلسٹ چین ان ہی اصولوں پر کاربند رہا۔ اس نے نہ تو کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ اور نہ ہی کسی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تخریبی کارروائیوں کا جال بچھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم میں اس کی مقبولیت بڑھتی رہی۔ ثقافتی انقلاب کے بعد جب چین نے اپنی سفارتی سرگرمیوں کا ازسرنو آغاز کیا تو اسے پے در پے کامیابیاں ہوئیں۔ ۱۹۷۰ء میں کناڈا کے علاوہ کئی افریقی ریاستوں نے بھی سوشلسٹ چین کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ چین نے اتنے عرصے میں معاشی صنعتی ترقی کے ایٹمی میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ اور ایٹمی قوت بن جانے کے بعد امریکی سامراج اور اس کے حواریوں کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ فارموسا کو ہی چین کا نمائندہ حکومت سمجھتے رہیں۔

عوامی جمہوریہ چین کو سامراج اور اس کے حواری اس لئے بھی تسلیم کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں کہ چین تمام ممالک کو ایک صف میں کھڑا کرنا چاہتا ہے اور وہ "بڑی طاقت" اور "چھوٹی طاقت" کی اصطلاحات پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تمام ممالک ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ وہ خود مختار ریاستیں ہیں۔ چنانچہ ۷ راگست ۱۹۷۱ء کو حکومت چین نے اعلان کیا۔

"دنیا کے تمام ممالک خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، دونوں میں مساوات ہونی چاہیئے۔ دنیا کے مختلف ممالک پر اثر انداز ہونے والے مسائل تمام ممالک کی مشترکہ گفت و شنید سے حل ہونے چاہئیں۔ بڑی طاقتوں کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیئے۔ بین الاقوامی تعلقات کا یہ بنیادی اصول ہے جس پر تمام ممالک کو عمل کرنا چاہیئے۔"
(پیکنگ ریویو ۳۳)

امریکی سامراج اپنی اجارہ داری کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اجارہ داری پر ہی اس کی بقا کا انحصار ہے۔ نو آزاد، ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے استحصال، ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ان پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا۔

جو ملک "دو چین کے نظریہ" کو تسلیم نہ کرتا ہو، تائیوان کو چین کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہو۔ عوامی جمہوریہ چین اس سے سفارتی تعلقات استوار کرنے کو تیار ہے کیونکہ خود چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے "ہمیں دوسرے ممالک سے سفارتی تعلقات بڑھانے چاہئیں۔ جن کی بنیاد علاقائی یکجہتی کے احترام، خود مختاری، مساوات اور باہمی مفادات پر ہونی چاہیئے۔ ان تمام ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے جو عالمی امن کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے تعاون پر آمادہ ہوں۔"

داؤد

پاکستان کا سب سے بڑا سیٹھ ہے

الفتح رپورٹ

کہا جاتا ہے کہ جب کرنافلی پیپر ملز فروخت ہوا تو سیٹھ داؤد نے کھڑے کھڑے کروڑوں روپے ادا کر دیئے۔ سیٹھ صاحب نے مختلف بنکوں کو فون کیا "میں احمد داؤد بول رہا ہوں۔ اتنے لاکھ روپے پی آئی ڈی سی کو دیدو" دیکھتے ہی دیکھتے رقم پہنچ گئی۔ اور سیٹھ داؤد سلام علیکم کہہ کر کرنافلی ملز کے مالک بن گئے۔

داؤد پیٹرولیم کا قیام بھی ایک سربستہ راز ہے۔ مرحوم الطاف حسین سابق مرکزی وزیر صنعت زندہ ہوتے تو اس کا پردہ چاک کرنے میں مزا آتا۔ ڈان نے مرحوم کو وزارت تک پہنچایا۔ اور مرحوم نے کرم فرمائی کے لئے داؤد کو چُنا۔

آج داؤد پاکستان کا سب سے بڑا سیٹھ ہے۔

اس گروپ کو پاکستان میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ٹاٹا کو ہندوستان میں۔ اسٹاک ایکسچینج میں درج شدہ اپنی سات کمپنیوں کے ادا شدہ سرمایہ کے حساب سے یہ گروپ دوسرے سرمایہ داروں کے مقابلے میں پہلے نمبر پر ہے۔ یہ ادا شدہ سرمایہ تقریباً انیس کروڑ ہے اور جب اس گروپ کا چھتیس کروڑ کا دیوہیکل داؤد فرٹلائیزر پروجیکٹ کام شروع کرے گا تو دوسرے اکیس سرمایہ دار اس گروپ کے سامنے بالکل معمولی "تاجر" نظر آنے لگیں گے۔

اس سے پہلے کہ داؤد گروپ کی اس ناقابل یقین "ترقی" کا جائزہ لیا جائے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تقسیم سے قبل بمبئی میں داؤد کی حیثیت کپڑے کے ایک معمولی تاجر سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری جنگ عظیم کی کمر توڑ گرانی اس گروپ کے لئے باعث رحمت ثابت ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے انسانی خون چاندی سونے کے سکوں میں ڈھلنے لگا۔ یہ ناجائز دولت لے کر داؤد پاکستان پہنچا اور اسی سرمایہ سے اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

۱۹۵۵ء میں داؤد پاکستانی سرمایہ داروں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر آ پہنچا۔ ۱۹۶۰ء میں بھی انہوں نے اپنی یہ پوزیشن برقرار رکھی۔ صرف آدم جی ان سے آگے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے آدم جی کو دھکیل دیا۔ لیکن ان کی پوزیشن اب بھی دوسری ہی رہی۔ کیونکہ اب کے پنجاب کے سرمایہ دار سہگل بازی لے گئے۔ لیکن ۱۹۶۹ء آتے آتے داؤد نے آدم جی اور سہگل کو دولت کی اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اور پہلے نمبر پر آ گیا۔

وہ سات کمپنیاں جن پر داؤد گروپ مشتمل ہے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ داؤد کاٹن ملز
۲۔ بورے والا کاٹن ملز
۳۔ کرنافلی پیپر ملز
۴۔ سنٹرل انشورنس کمپنی
۵۔ لارنس پور وولن اور کاٹن ملز
۶۔ کرنافلی ریان اینڈ کیمیکلز
۷۔ داؤد پیٹرولیم

۱۹۶۶ء میں ان سات کمپنیوں کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ پندرہ کروڑ ہو چکا تھا اور انکے ASSETS چھیالیس کروڑ تک جا پہنچے تھے

سنٹرل انشورنس کمپنی اور شاید داؤد پیٹرولیم کو چھوڑ کر باقی ساری کمپنیوں پر داؤد خاندان کی مکمل اجارہ داری ہے۔

داؤد کی سب سے پہلی کمپنی ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۵۳ء میں اسٹاک ایکس چینج کی لسٹ پر آئی۔ اس کا اداشدہ سرمایہ صرف ۵۰ لاکھ تھا اور یہ روپیہ ۱۹۶۹ء تک یعنی اٹھارہ سال میں ۱۸۹۹ لاکھ روپیہ بن گیا۔ یعنی تین ہزار چھ سو اٹھانوے فی صد منافع۔

پاکستان کے پانچ سالہ منصوبوں کے ساتھ ساتھ داؤد کا سرمایہ کچھ یوں بڑھا۔

سال	داؤد کا اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵ء	۷
۱۹۶۰ء	۸
۱۹۶۵ء	۹
۱۹۶۹ء	۱۹

یعنی ۱۹۵۵ء سے پہلے صرف چار سال میں پچاس لاکھ کا اداشدہ سرمایہ سات کروڑ ہوگیا۔ اور پھر ۱۹۶۵ء کے بعد صرف چار سال میں ۹ کروڑ روپیہ انیس کروڑ روپیہ بن گیا۔ ذرا غور فرمایئے یہ تجارت ہے یا راہ زنی؟

۱۹۶۵ء سے پہلے ان کی کمائی کا ذریعہ صرف دو ملیں (بورے والا ٹیکسٹائل اور کرنافلی پیپر ملز) تھیں۔ یہ دونوں ملیں پبلک سیکٹر سے داؤد کے نام منتقل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ایک اور مل (لارنس پور وولن) ان کے حوالے کی گئی۔ اس طرح ۱۹۶۵ء میں داؤد کی پانچ کمپنیوں کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ ۹ کروڑ ہو چکا تھا۔ اور اس کا ۷۵ فی صد حصہ پبلک سیکٹر کے ان تین پروجیکٹوں کا مرہون منت ہے اور اس کے بعد داؤد اس سرمایہ سے اپنی عظیم الشان صنعتی سلطنت کو مستحکم کرتا چلا گیا۔

۱۹۶۵ء کے بعد داؤد نے داؤد کاٹن ملز اور بورے والا ٹیکسٹائل ملز کے لئے نیا سرمایہ فراہم کیا اور ساتھ ہی دو نئے پراجیکٹ شروع کئے۔ یہ نئے پراجیکٹ کرنافلی ریان ملز اور داؤد پٹرولیم تھے۔ اس کے بعد ۳۰ کروڑ کے اس دیوپیکر فرٹلائیزر کا نمبر آیا۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ابھی ابتدا ہے انتہا کیا ہوگی؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

داؤد کی کمپنیوں کے اداشدہ سرمایہ میں انفرادی طور پر کیسے اضافہ ہوا؟ ملاحظہ فرمایئے۔

سال	کرنافلی پیپر	بورے والا ٹیکسٹائل	داؤد کاٹن	سنٹرل انشورنس	لارنس پور	کرنافلی ریان	داؤد پٹرولیم	میزان
	لاکھوں میں							
۱۹۵۳	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۵۰	–	–	–	–	۶۶۰
۱۹۵۵	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۵۰	–	–	–	–	۶۶۰
۱۹۵۶	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۷۵	–	–	–	–	۶۸۵
۱۹۵۷	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۷۵	–	–	–	–	۶۸۵
۱۹۵۸	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۷۵	–	–	–	–	۶۸۵
۱۹۵۹	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۱٫۲۰	–	–	–	–	۷۳۰
۱۹۶۰	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۱٫۵۰	–	–	–	–	۷۶۰
۱۹۶۱	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۱٫۵۰	۲۵	–	–	–	۷۸۵
۱۹۶۲	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۱٫۵۰	۲۵	۹۳	–	–	۸۷۹
۱۹۶۳	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۲۰۰	۲۵	۹۳	–	–	۹۲۹
۱۹۶۴	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۲۰۰	۲۵	۹۳	–	–	۹۲۹
۱۹۶۵	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۲۰۰	۲۵	۹۳	–	–	۹۲۹
۱۹۶۶	۴٫۶۰	۱٫۵۰	۳۰۰	۲۵	۹۳	۴٫۵۰	–	۱۳٫۷۹
۱۹۶۷	۴٫۶۰	۲٫۲۵	۳۰۰	۲۵	۹۳	۴٫۵۰	–	۱۵٫۵۳
۱۹۶۸	۴٫۶۰	۲٫۷۰	۳٫۶۰	۲۵	۹۳	۴٫۵۰	–	۱۶٫۵۹
۱۹۶۹	۴٫۶۰	۲٫۷۰	۴٫۰۰	۲۵	۹۳	۴٫۵۰	۳٫۰۰	۱۸٫۹۹

اگر مندرجہ بالا کمپنیوں کی کارکردگی کے میدان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ داؤد گروپ نے صنعت کے ہر میدان میں قسمت آزمائی کی ہے۔ کاٹن ٹیکسٹائل، وولن ٹیکسٹائل، ریان، پیپر اور پھر پٹرولیم اور انشورنس جیسی صنعتیں جن کا آپس میں کوئی تعلق یا واسطہ ہی نہیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ فائننشل سرمایہ کو ہمیشہ صنعتی سرمایہ پر ترجیح دی گئی ہے۔

۱۔ داؤد کاٹن ملز

یہ مل ۱۹۵۱ء میں پبلک لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت سے معرض وجود میں آئی اس میں ۵۵۶۰۰ اسپنڈل (کرگھے)، ۵۶۰۰ ڈبل کرنے والے کرگھے اور ۱۰۰۰ خودکار کھڈیاں لگائی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہائیڈروجن پر آکسائڈ بنانے کا ایک پلانٹ پی آئی سی آئی سی (PICIC) سے قرضہ لے کر لگایا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں کھڈیوں کی تعداد ۱۲۵۰ اور کرگھوں کی تعداد ۶۰،۰۰۰ ہوگئی۔ یہ مل جتنا کپڑا ملک میں بیچتی تھی۔ اس سے دوگنا کپڑا برآمد کرتی تھی۔ اس کے علاوہ دھاگے کی خاصی مقدار بھی برآمد ہوتی تھی۔ ایکسپورٹ بونس اسکیم کی وجہ سے داؤد نے غیر ملکی تجارت میں خوب ہاتھ رنگے۔

۲۔ بورے والا ٹیکسٹائل ملز

یہ مل پنجاب گورنمنٹ نے منڈی بورے والا (ملتان ضلع) میں لگائی تھی۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں یہ مل ایک منافع بخش ادارہ قرار پایا۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں اچانک گیارہ لاکھ کا خسارہ ہوگیا اور اس خسارے نے داؤد کی قسمت کھول دی۔ انہوں نے سو روپے کی قیمت کے حصے اسی قیمت پر خرید لئے حالانکہ مل کے ASSETS کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ قیمت خاصی زیادہ ہونی چاہیئے تھی۔

جب یہ مل قائم ہوئی تو اس میں ۵۱۲۰۰ کرگھے تھے بعد میں PICIC سے غیر ملکی کرنسی کی صورت میں قرضہ حاصل کیا گیا۔ اور ۱۰۴۰ برقی کھڈیاں نصب کی گئیں۔ اور ساتھ ہی ایک PVC پلانٹ، ایک جننگ فیکٹری اور ایک مویشیوں کی خوراک کا پلانٹ بھی لگایا گیا اور ۱۹۶۸ء تک یہ مل بیرونی تجارت کے سلسلہ میں داؤد کاٹن ملز کو بھی مات دے گئی۔

۳۔ کرنافلی پیپر ملز

یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء میں انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے چندر گونا کے مقام پہ قائم کی۔ یہ مل دریائے کرنافلی کے کنارے چاٹگام سے تقریباً بائیس میل دور واقع ہے۔ توقع تھی کہ یہ مل بانس اور لکڑی کے گودے سے تقریباً ۳۰ ہزار ٹن کاغذ تیار کیا کرے گی۔ اس کے ساتھ ایک کاسٹک سوڈے کا پلانٹ اور ایک گندھک کے تیزاب کا پلانٹ بھی لگایا گیا اور پھر ایک دن چپکے سے یہ پراجیکٹ بھی داؤد کی جیب میں چلا گیا۔ کاغذ ایک بنیادی ضرورت ہے اس لئے اس مل کا، پرائیویٹ سیکٹر کو منتقل ہونا انتہائی قابل اعتراض بات تھی۔

۴۔ لارنس پور ملز

۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی تاکہ یہ پاکستان کو اعلیٰ وولن اور ٹیکسٹائل ملز

۱۹۵۱ء میں صرف ۵۰ لاکھ روپے اور ۱۹۷۰ء میں ۱۹ کروڑ روپے

لمیٹڈ کی جانشین بن سکے۔ اس مل میں ۷۰۰ وورسنڈ اور ۲۹۶۰ ورلن کر گھے تھے اور کوئی ۱۹۲ برتی کھڈیاں تھیں۔ ایک جدید وول ٹاپ پلانٹ بھی نصب کیا جا چکا تھا۔

۵۔ کرنافلی ریان کیمیکلز لمیٹڈ

۷ر دسمبر ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت اس کا نام داؤد کیمیکلز لمیٹڈ تھا اور اسے صرف کاسٹک سوڈا، کلورین اور ہائیڈروکلورک ایسڈ بنانا تھا۔ بعد میں اس میں اور توسیع کی گئی تاکہ یہ ریان دھاگہ اور شفاف کاغذ بھی بنا سکے اب اس کے نام میں تبدیلی کرنا ضروری ہو گیا تھا اور متعلقہ تبدیلی کے لئے قانونی اجازت ۱۹۶۴ء میں حاصل کی گئی۔

سرمایہ کے لئے پراسپکٹس ۱۹۶۶ء میں شائع کیا گیا۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے عمارت مکمل ہو چکی تھی اور پلانٹ بھی لگ چکا تھا اور ریان دھاگہ کی تیاری تو جاکر کہیں ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئی۔ اس پلانٹ کو ۳۴۰۰ ٹن ریان دھاگہ ۷۰۰، ان شفاف کاغذ، ۱۰۳۰۰ ٹن سلفیورک ایسڈ، ۵۷۸۰ ٹن کاسٹک سوڈا، ۵۱۰۰ ٹن کلورین، ۳۷۴۰ ٹن ہائیڈروکلورک ایسڈ، ۲۰۴۰ ٹن کاربن ڈائی سلفائیڈ، ۳۴۰ ٹن کلورین ڈائی آکسائیڈ اور ۵۱۰۰ ٹن سوڈیم سلفیٹ سالانہ تیار کرنا تھا۔

اس کمپنی نے اپنی پروڈکشن مارچ ۱۹۷۰ء میں شروع کی اس سے پہلے ۱۹۶۴ء میں PICIC سے دو مختلف النوع کے قرضوں کے لئے معاہدے کئے جا چکے تھے۔ ایک قرضہ ۳۱،۸۰۳،۴۰۳ امریکن ڈالر کا اور دوسرا ۳۲۴۰،۰۰۰،۰۰ جاپانی ین کا۔ ایک اور قرضہ ۱۹۶۵ء میں ۶۱،۰۳۴۴،۰۰۰ ین کا جاپان سے لیا گیا جس کی مالیت پاکستانی روپیہ میں ۸۰،۷۴۰،۰۰۰ بنتی ہے۔

کرنافلی ریان اور کیمیکلز لمیٹڈ ملک کی کل ضروریات کا ½ حصہ ریان بناتی ہے۔ اور ہر قسم کی ریان کی امپورٹ بند ہے اور اس طرح سے اس کمپنی کو بند مارکیٹ کے پورے فوائد حاصل ہیں۔

۶۔ سنٹرل انشورنس کمپنی

میمورینڈم آف ایسوسی ایشن کی رو سے اس کمپنی کو ہر قسم کا انشورنس کا کام کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ صرف جنرل انشورنس کا کام اپنے نام سے کرتی ہے۔ اور لائف کا کام اپنے ایک ذیلی ادارے، سنٹرل لائف انشورنس کے نام ڈال رکھا ہے۔ اس ذیلی کمپنی کو رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء میں ملا تھا۔ اس کمپنی پر داؤد خاندان کی مکمل اجارہ داری ہے۔ اور یہ اسی خاندان کے ذاتی انشورنس بزنس پر چل رہی ہے۔ ایک انشورنس ایگزیکٹو کی رائے کے مطابق اگر انشورنس کمپنی صرف ایک امیر خاندان کی لونڈی ہو تو اسے قومی ملکیت میں لے لینا ہی بہتر ہے۔

۱۹۶۶ء میں داؤد پٹرولیم کو چھوڑ کر باقی چھ کمپنیوں کے ڈائریکٹروں کی کل تعداد اکیاون تھی۔ جس میں چیئرمین اور مینجنگ ڈائریکٹرز شامل ہیں۔ ان اکیاون ڈائریکٹروں میں سے کم از کم بائیس تو داؤد خاندان کے گھر کے افراد ہیں۔

داؤد خاندان کے افراد کے نام	چھ کمپنیوں میں ڈائریکٹروں کی تعداد
احمد داؤد ایس۔ کے	۶
صدیق داؤد	۵
سلیمان داؤد	۴
ڈاکٹر فاروق داؤد	۲
یعقوب سلیمان داؤد	۲
علی محمد داؤد	۱
یوسف اے داؤد	۱
عزیز اے داؤد	۱
	۲۲

داؤد خاندان کی سب سے اہم شخصیت احمد داؤد ہے۔ اسے داؤد کی ساری کمپنیوں کی کارکردگی کا محور سمجھنا چاہیئے۔ باقی ڈائریکٹروں میں سے بھی اکثر داؤد کے پرانے نمک خوار ہیں۔

داؤد کی کمپنیوں کے کچھ ڈائریکٹر پاکستان کے دو اور بڑے سرمایہ دار خاندانوں میں سے لئے گئے ہیں۔ یہ خاندان آدم جی اور باوانی ہیں۔

اب اگر مجموعی طور پر داؤد گروپ کی سات کمپنیوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے تین کمپنیاں پبلک یا نیم پبلک سیکٹر سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور تین کمپنیوں کو مکمل اجارہ داری کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ منافع ہو رہا ہے۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ داؤد پاکستانی سرمایہ داروں کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔

۱۳ کے ہندسے نے پاکستانی ٹیم کو شکست سے دوچار کیا

لطافت علی صدّیقی

انگلینڈ میں پاکستان کرکٹ ٹیم کی ناکامی کے بارے میں ریڈیو، ٹی وی، اور اخبارات میں متعدد بار تبصرے ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مسئلے میں اب ایسی کوئی بات نہیں رہ گئی جس پر مزید اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی جائے۔ یہ ایک بے جان مسئلہ بن چکا ہے۔ اور اب اس باب کو بند ہی کر دینا چاہیئے۔

لیکن دوسری طرف عوام میں اس ہزیمت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

یہاں میں ان اسباب پر دوبارہ اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جن پر کھیل کے ماہرین بار بار روشنی ڈال چکے ہیں۔ نہ ہی اس شکست کی ذمہ داری پاکستانی ٹیم پر دھروں گا کہ اگر بغاوت کامیاب ہو جائے تو اُسے انقلاب کا نام دیا جاتا ہے اور اگر ناکام ہو جائے تو اُسے بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہماری ٹیم کے بارے میں بھی بالکل یہی فارمولا اپنایا جاتا ہے۔ اگر ہماری ٹیم کامیاب ہو جاتی تو کھلاڑیوں کو قومی ہیرو بنا دیا جاتا ہے اور اگر ہار جائے تو پھر کھلاڑیوں کے حصّے میں تنقید اور گالیوں کے ڈھیر آتے ہیں۔

میں یہاں تقدیر یا اتفاقات کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ جو کھیل میں اپنے عجیب و غریب کردار سے فتح و شکست کا پانسہ پلٹ دیتے ہیں۔ ایڈن گبسٹن کے پہلے ٹسٹ میں جب برطانیہ فالو آن پر مجبور تھا اور ہمارے جیتنے کے امکانات روشن تھے تو غیر متوقع بارش نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

تیسرے ٹسٹ میچ پر آ جایئے۔ یہاں بھی تقدیر کی ستم ظریفی سے ہماری ٹیم محفوظ نہ رہ سکی۔ ۷ کا ہندسہ خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ۱۳ کا ہندسہ بدقسمتی پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ تیسرے ٹسٹ میچ کے چوتھے روز بی بی سی کے کمنٹیٹر نے کہا "بوائے کاٹ ۱۳ کے منحوس ہندسے پر ہے۔" اس کے ساتھ ہی کھیل کا پانسہ پلٹنے لگا۔ اتفاق سے وہ اسی گیند پر آؤٹ ہو گیا۔ بوائے کاٹ کے جانے کے بعد برطانیہ کے وکٹ تیزی سے گرنے لگے۔ پاکستانی وکٹ کیپر وسیم باری وایئں بایئں جانب غوطہ لگا کر انتہائی مشکل کیچ لے رہا تھا۔ اس کھیل میں پاکستانی کھلاڑیوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سلیم الطاف نے صرف چار رن دے کر آخری تین وکٹ بھی حاصل کر لئے۔ یقیناً وہ پاکستان کا دن تھا۔ آفتاب گل نے اپنے کھیل سے پاکستانی ٹیم کو کامیابی سے مزید قریب کر دیا۔ اس طرح کھیل کا چوتھا دن، پاکستان کے لئے ایک متوقع کامیابی کی اُمید پر ختم ہوا۔ ہر پاکستانی مسرور و شاداں تھا کہ پاکستانی ٹیم انگلینڈ کی پٹائی اس کی شایان شان کر رہی ہے۔

کوئی کرکٹر جذبات اور خوشی کے عالم میں اس رات بمشکل ہی سے سو سکتا ہے۔ جبکہ اس کی کامیابی کی راہ میں صرف رات کی تاریکی کا فاصلہ رہ گیا ہو۔ کھیل کے چوتھے روز کی تاریخ ۱۲ر جولائی تھی۔ کھیل کے پانچویں دن کی تاریخ ۱۳ر جولائی تھی پانچویں دن جونہی کھیل کا آغاز ہوا، آفتاب گل پہلے ہی اوور میں آؤٹ ہو گیا۔ ظہیر عباس جس نے پہلے ٹسٹ میں ۲۷۴ رن کا اسکور کر کے ایک تاریخ مرتب کی تھی۔ دوسرے گیند پر کوئی رن بنائے بغیر آؤٹ ہو گیا۔ وہ اپنے دورے میں پہلی بار صفر پر آؤٹ ہوا تھا۔ اس کے بعد مشتاق محمد آؤٹ ہوا۔ پھر سعید کھیلنے آیا، مگر وہ بھی نہ کھیل سکا اور اس کے آؤٹ ہوتے ہی پاکستان کی متوقع کامیابی ناکامی کے گہرے بادل میں ڈوب گئی۔ پاکستان کے سارے کھلاڑی صرف ۲۵ رنز پر آؤٹ ہو گئے۔

پاکستان کی اس ناکامی میں ۱۳ کے ہندسے نے پہلی بار اپنا منحوس سایہ نہیں پھیلایا بلکہ اس تاریخ کو جب بھی ٹسٹ شروع ہوا، یا ختم ہوا پاکستان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۵۲ء میں پاکستانی ٹیم ٹسٹ میچ کھیلنے بھارت گئی۔ پہلا میچ دہلی میں ہوا۔ جس میں پاکستان بھارت کے ہاتھوں ایک اننگ اور ۷۵ رن سے ہار گیا۔ لیکن پاکستان نے دوسرے ٹسٹ میں بھارت کو ایک اننگ ۴۳ رن سے شکست دے کر انتقام لے لیا۔

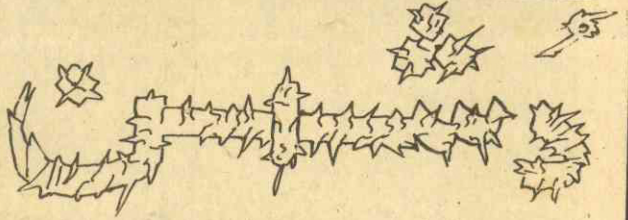
تیسرا ٹسٹ ۱۳ر نومبر کو بمبئی میں شروع ہوا۔ اور اس میں پاکستان ہار گیا۔

۱۹۵۸ء میں ویسٹ انڈیز اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ جس میں محمد حنیف نے ۹۹۹ منٹ میں ۳۳۷ رن بنا کر سب سے طویل اننگ کا ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ لیکن پاکستان چوتھے ٹسٹ میں ویسٹ انڈیز سے ہار گیا۔ اتفاق سے یہ میچ ۱۳ر مارچ کو شروع ہوا تھا۔

دوسرے سال پاکستان کی ٹیم ٹسٹ کھیلنے آسٹریلیا گئی۔ پہلا ٹسٹ ۱۳ر نومبر کو شروع ہوا اور پاکستانی ٹیم آٹھ وکٹوں سے یہ میچ ہار گئی۔

۱۹۵۴-۵۵ء میں بھارت کی ٹیم پاکستان آئی۔ گو پاکستان اور بھارت کے ٹسٹ میچ ہار جیت کے بغیر ختم ہوئے۔ مگر حیدر آباد میں ایک غیر سرکاری میچ میں سندھ کی ٹیم ہار گئی۔ یہ میچ ۱۳ر جنوری ۱۹۵۵ کو ختم ہوا تھا۔

ہمارا اصل اور مشترک



مغربی سامراج ہے

مصر، لیبیا اور سعودی عرب کے دورے سے واپسی پر مولانا مفتی محمود سے محمود شام کی خصوصی ملاقات

"آپ سمجھتے ہیں کہ یہود آپ کے دشمن ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہنود ہمارے دشمن ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اصل دشمن مشترک دشمن ہے۔ اور وہ ہے مغربی استعمار۔ ہمارے مسائل بھی مشترک ہیں۔ اور اُن کا حل بھی مشترک۔ یہ مشترک مسائل عالمِ اسلام کے اتحاد کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔"

یہ جمعیت علمائے اسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا مفتی محمود کی اُس تقریر کے الفاظ ہیں جو انہوں نے مصر کے شہر اسکندریہ میں ۳۷ ملکوں کے طالب علموں کے ایک اجتماع میں کی۔ مغربی سامراج کے خلاف یہ نعرہ انہوں نے مصر، سعودی عرب اور لیبیا کے حالیہ دورے میں ہر جگہ بلند کیا۔ مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی گذشتہ ماہ ۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء کو مصری حکومت کی دعوت پر قاہرہ گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے خرچ پر لیبیا اور سعودی عرب کا دورہ بھی کیا اور عمرہ بھی ادا کیا۔

اس دورے سے واپسی پر میں نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن میں اُن سے ملاقات کی اور اس دورے کے تاثرات جاننے چاہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس دورے کی دعوت انہیں جامعہ ازہر کی سپریم کونسل برائے اسلامی امور کے ڈائریکٹر نے دی تھی۔ وہ ۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء کو قاہرہ پہنچے۔ اُن کا قیام یہاں قلوپطرہ ہوٹل میں رہا۔ مصر میں وہ ۱۸ روز تک رہے۔ مختلف اہم شخصیتوں سے ملاقات کے علاوہ انہوں نے بعض مقامات بھی دیکھے۔ جن میں انہوں نے قصرِ عابدین کا خاص طور پر ذکر کیا۔ وہ شیخ الازہر ڈاکٹر فہام سے ملے۔ جامعہ ازہر کے ریکٹر کا درجہ وہاں کسی وزیر سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر علیم محمود، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (مجمع السجود الاسلامیہ) کے جنرل سیکرٹری عبدالرحمٰن بیصار، عرب لیگ کے سیکرٹری عبدالخالق حسونا سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مصر کے صدر انور سادات سے اُن کی ملاقات تو ہوئی مگر بڑی سرسری۔ یہ ۲۳ جولائی ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ جب مصر اپنی آزادی کی سالگرہ منا رہا تھا۔ یومِ آزادی کی تقریب میں دونوں حضرات کو خصوصی دعوت دی گئی۔ اور گیلری میں اُن کی نشست سفیروں کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ اس تقریب میں صدر سادات نے اڑھائی گھنٹے تک ایک نہایت اہم اور تاریخی تقریر کی۔ جس میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر تبصرہ کیا۔ انور سادات نے روس کی امداد کا خصوصیت کے ساتھ شکریہ ادا کیا، اور فرانس کا بھی اور بتایا کہ ان ممالک نے ہمارے موقف کی تائید کی ہے — انور سادات امریکہ کے خلاف بولے اور جی کھول کر۔ اسلامی ملکوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہمارے موقف کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا کہ پاکستان سرِفہرست ہے انہوں نے اپنی تقریر میں بار بار کہا کہ "ہم موجودہ پوزیشن کو آئندہ کے لئے کبھی قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ لڑائی ہے نہ صلح۔ ہم بیچ ہی معلق ہیں۔ صدر سادات نے کہا کہ ہم ۱۹۷۱ء کو گزرنے نہیں دیں گے۔ یہ فیصلہ کن سال ثابت ہوگا۔ یا تو سیاسی فیصلہ یا حرب"

مفتی صاحب نے بتایا کہ قاہرہ میں مختلف ملاقاتوں اور بہت کچھ دیکھنے کے بعد وہ اسکندریہ میں گئے۔ جہاں وزیر اوقاف ڈاکٹر توفیق عویضہ کی صدارت میں مصر میں زیرِ تعلیم ۳۷ ملکوں کے طلبہ کا اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ اس اجتماع میں مفتی محمود صاحب کو بھی

مولانا مودودی کے بیان نے مشرق وسطیٰ میں غلط صورتِ حال پیش کی



لیبیا کے روزنامہ الثورۃ میں شائع ہونیوالی ایک تصویر۔ مفتی محمود اور غلام غوث ہزاروی اخبار نویسوں سے مخاطب ہیں

تقریر کی دعوت دی گئی۔ مفتی صاحب نے وہاں عربی میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کا موقف پیش کیا۔ پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ اور اس بات پر زور دیا کہ ہمارا اصل دشمن مغربی سامراج ہے اور ہمیں اس کا مقابلہ متحد ہو کر کرنا چاہیئے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ انہوں نے مصر میں مجموعی تاثر یہی پایا کہ اب وہاں کے عوام پاکستان کے موقف کے دل سے پر زور حامی ہیں۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ انہی دنوں سوڈان میں انقلاب کی ناکام کوشش ہوئی۔ سوڈان کے انقلاب سے مصر کے لوگ پریشان نظر آتے تھے۔ یہ اضطراب سرکاری سطح پر بھی تھا۔ اور عوامی حلقوں میں بھی اس انقلاب سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ اور جب نمیری دوبارہ برسرِ اقتدار آئے تو دوبارہ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نمیری کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کی خبر ہمیں اُس وقت ملی تھی جب اسکندریہ میں اجتماع ہو رہا تھا۔ میں جب تقریر کر رہا تھا، اُس وقت ایک شخص نے آ کر ریڈیو کی یہ اطلاع پہنچائی۔ حاضرین نے ۱۵ منٹ تک تالیاں بجا بجا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور وہاں سوڈان کے جو طلبہ مقیم تھے وہ تو بے اختیار گلے ملنے لگے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سوڈان کے لوگ بھی نمیری کے دوبارہ آنے سے مطمئن ہوئے۔ وہ لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں برطانیہ کا ہاتھ ہے۔ اس ناکام انقلاب کے لئے منصوبہ ابوبکر النوّر نے برطانیہ میں بیٹھ کر تیار کیا تھا۔ اس واقعے سے ایک بار پھر وہ مثل صادق آئی کہ اگر سمندر کی تہ میں بھی دو مچھلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو اس میں برطانیہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

میں نے ناصر کے بعد مصر کا حال پوچھا کہ انور سادات کے زمانے میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب نے اپنی اسکندریہ کی تقریر کے یہ جملے دُہرائے۔

"جب جمال عبدالناصر کا انتقال ہُوا تو اس سے ہمیں بڑی پریشانی لاحق ہُوئی تھی۔ ہم بے حد فکر مند تھے۔ عربوں کے موجودہ نازک حالات میں اُن کی قیادت کون کرے گا۔ اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اس خلاء کو پُر کر سکے گا۔ لیکن انور سادات نے ایک برس سے کم عرصے میں اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور تدبّر کا وہ ثبوت دے دیا ہے جس کے بعد کافی حد تک جمال عبدالناصر کا خلاء پُر ہو گیا ہے۔"

مفتی صاحب نے بتایا کہ مصر کے لوگ اس سے بڑے مطمئن ہیں کہ یہ شخص دیندار، دیانتدار، سیدھا سادا اور پختہ کار سیاست دان ہے۔

میں نے سادات کے خلاف سازش کرنے والوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ لوگ کمیونسٹ تھے میں نے پوچھا کونسے، چینی کہ روسی؟ مفتی صاحب نے کہا یہ روسی کمیونسٹ تھے۔ سوڈان والا معاملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

ہم نے وہ فوجی اڈے دیکھے جہاں سے امریکی سامراج کو بھگا دیا گیا ہے

وہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ انور سادات کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سیاستدان ہونے کے باوجود دیندار بھی ہے۔ دینداری اُس کی شہرت کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے میں نے مفتی صاحب کو ٹوک کر پوچھا: کیا سیاستدان دیندار نہیں ہو سکتا۔ اس پر حیرت کیوں "مفتی صاحب مسکراتے اور کہنے لگے "مشکل ہے۔ اب تو سیاست ڈپلومیسی کا نام ہے۔ دُوسرے لفظوں میں عیاری کا"

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ مفتی صاحب نے بتایا کہ عوام مساوات سے عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ عقیدت ہم نے محسوس کی کہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ ہے۔

روس کے بارے میں مصر کا ردّ عمل پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سادات کا کمال ہے کہ روسی کمیونسٹوں پر اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے الزام کے باوجود روس سے تعلقات خراب نہیں ہوئے۔ جب روس کے صدر پوڈگورنی مصر آئے تو سادات نے صاف بتا دیا کہ یہ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے۔ اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں ہے۔ روس کے ساتھ معاہدے میں جو تجدید ہُوئی ہے کہ کوئی ایک دُوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ یہ شرط یکطرفہ ہی ہے۔ کیونکہ مصر کو روس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کہاں کرنا ہو گی۔ مداخلت اگر کرے گا تو روس کرے گا۔ اس لئے اس شرط کا اطلاق روس پر ہو گا۔ یوم آزادی کے موقع پر روسی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری بھی آیا تھا۔ وہ کئی روز تک مقیم رہا۔ سادات نے اپنی یوم آزادی کی تقریر میں پرجوش انداز میں روس کا شکریہ بھی ادا کیا۔ مفتی صاحب نے بتایا کہ مصر نے درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔

"پاکستان کے بارے میں مصری کیسے سوچتے ہیں؟" میرے اس سوال کے جواب میں مفتی صاحب

انور سادات نے روس کو مصر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے روک دیا

نے بتایا کہ ہم نے وہاں جاکر ایک بیان عربی میں لکھ کر تقسیم کروایا تھا۔ اخبارات کو بھی دیا تھا۔ جس میں مشرقی پاکستان کے حالات ابتدا سے لیکر فوجی اقدام تک دیئے گئے تھے۔ یہ اپنے سفارتخانے کے ذریعے بھی تقسیم ہوا۔ سیاسی لیڈروں اور مشائخ تک بھی پہنچایا۔ ان دنوں یوم آزادی کی تقریبات میں شرکت کے لئے مختلف وفود آتے ہوئے تھے۔ ان کو بھی یہ پمفلٹ دیئے گئے۔ اس پمفلٹ میں عام انتخابات سے لے کر ڈھاکہ میں مختلف سیاسی لیڈروں کی بات چیت، صدر یحیٰی سے مجیب کے مذاکرات تک کی تفصیلات بتائی گئیں اور برطانیہ امریکہ اس بحران میں سازشی کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ مصر اور لیبیا کے اخبارات نے ان تفصیلات

سمندر کی تہ میں بھی دو مچھلیاں
آپس میں لڑیں تو اس
میں برطانیہ کا ہاتھ ہوتا ہے

کو بڑے نمایاں انداز سے شائع کیا۔

مفتی صاحب اور ہزاروی صاحب نے ایک ہفتے تک لیبیا میں قیام کیا۔ وہ بتانے لگے کہ قذافی ہمیں بہت پسند ہے۔ بڑا جری مسلمان ہے لیبیا کے لوگ بڑے سچے مسلمان ہیں۔ انہوں نے طرابلس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں کہا کہ "ہم لیبیا کے لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ان کے ایمان قوی ہیں دوسرے یہاں کے لوگ اور حکومت اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ استعمار غربی ہی دراصل تمام قوموں کو غضب کرنے کا پروگرام بناتے ہوئے ہے"

ہم نے لیبیا میں وہ فوجی اڈے بھی دیکھے جو مغربی سامراج نے اپنے لئے قائم کر رکھے تھے۔ ہمیں ان اڈوں کے قیام کا بہت قلق تھا۔ جب انقلاب کی خبر آئی اور پھر ان اڈوں کے ہٹائے جانے کی اطلاع ملی تو ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی تھی۔ پاکستان میں لیبیا کے سفارت خانے کے ذریعے ہم نے مبارک باد بھی بھیجی تھی۔

حکومت لیبیا سے ہم ایک ضروری گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ لیبیا کے پاس فوج بہت کم ہے جبکہ رقبہ پاکستان سے بھی زیادہ ہے۔ تیل کے ذخائر ہیں اس لئے ہر وقت خطرہ لاحق رہ سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہر بالغ نوجوان فوجی تربیت حاصل کرے سامراج نے لیبیا کو پسماندہ رکھا۔ یہاں کے افراد کی اکثریت ان پڑھ ہے۔ اس لئے علوم و فنون پڑھائے جائیں۔ مدرسے کھولے جائیں، اسلامی ملکوں میں وفود بھیجے جائیں۔

پاکستان اسلام کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ ہمارے دشمن ایک ہیں۔ ہمارا جسم اور روح ایک ہے۔ ہمارا خون بھی آپ کے خون کے ساتھ بہے گا۔

مفتی صاحب نے ایک اخبار کا تراشہ دکھایا۔ جس میں مولانا مودودی صاحب کا ایک بیان چھپا ہوا تھا۔ اس بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ہم مغربی پاکستان کھلاتے رہے ہیں۔ ان کا تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ پاکستان ہم نے آزاد کروایا ہے۔ مفتی صاحب نے بتایا کہ دوسرے ممالک میں اس کا نہایت برا اثر پڑ رہا ہے۔ بلکہ دوسرے ممالک میں مقیم مشرقی پاکستانی بھائی اس پر غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ اس نفرت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش ہے جو مجیب اور اس کے ساتھیوں نے پھیلائی ہے۔

مولانا مفتی محمود کا یہ بیان طرابلس کے اخبارات "الحقیقۃ" اور "الشورہ" میں نہایت تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ ٹیلی ویژن نے پندرہ منٹ تک مفتی صاحب کی تقریر نشر کی۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ قذافی سے ملاقات طے ہوئی تھی لیکن وہ عرب سربراہوں کی کانفرنس کی تیاریوں کی وجہ سے مصروف ہو گئے۔ اس لئے انہوں نے طرابلس کے گورنر سے کہا کہ وہ ہم سے ملاقات کرلیں۔ اس میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہم نے پاکستان کے موقف سے انہیں آگاہ کیا۔ ان کا رویہ بڑا دوستانہ تھا۔



غلام غوث ہزاروی

ہم نے طرابلس میں مفتی طرابلس کا دارالافتاء دیکھا۔ یہ دارالافتاء گورنر کے محل سے بھی بلند و بالا اور عظیم الشان تھا۔

سعودی عرب میں انہوں نے دس روز تک قیام کیا۔ عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ پھر مدینہ منورہ آئے۔ یہاں وہ مشرقی پاکستان کے لوگوں سے ملے۔ ان کے ذہنوں میں بہت سے شبہات تھے۔ مفتی صاحب نے انہیں اپنے انداز سے سمجھا کر ان کے شبہات بڑی حد تک دور کئے۔

مفتی صاحب ان ممالک میں پاکستانی سفارتخانوں کی کارکردگی سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان میں اصلاح کی ضرورت ہے اور انہیں اپنے دفتروں سے نکل کر اخبارات سے رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔ بھارتی پراپیگنڈے کا موثر جواب دینا ضروری ہے۔



پھانسی گھر سے ایک خط

جنابِ صدر!

پھانسی پانے والے فریاد کرتے ہیں

میں خود ایک قیدی ہوں۔ میں آپ کے مؤقر جریدہ کی وساطت سے ان سینکڑوں پھانسی پانے والے مجرمین کی آواز اور آخری خواہش اپنے محترم اور مخلص صدر صاحب کی خدمت تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ کامل امید ہے کہ آپ ان چند سطور کو مناسب جگہ عنائت کرکے بے آواز مرنے والوں کی طرف سے ان گنت دعائیں لیں گے۔ اب میں صدر محترم سے مخاطب ہوتا ہوں۔

جنابِ صدر! جیل کے اندر پھانسی پانے والے آج کل کس طرح رکھے جاتے ہیں؟ امید ہے آپ کو اس کا علم ہوگا۔ تاہم میں بحیثیت ایک قیدی اس صورت حال کی صحیح تصویر کشی کرتا ہوں۔ مجرم کو جونہی سیشن اینڈ ڈسٹرکٹ جج سے سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے جیل والے اس مجرم کو ایک الگ چکی (CELL) میں اچھی طرح سے تلاشی لے کر بند کر دیتے ہیں۔

۲۴ر گھنٹوں میں دو وقت یعنی صبح و شام کو آدھ (آدھ گھنٹہ) کی چہل قدمی کے لئے ان بدقسمت مجرمین کو باہر (OPEN) نکالا جاتا ہے۔ مگر باہر نکالنے سے پہلے موت کی سزا پانے والے دو مجرموں کو ایک ہی ہتھکڑی میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اب دونوں ہتھکڑی سمیت یہ گنتی کے چند منٹ چہل قدمی کرتے رہتے ہیں۔ یہ چہل قدمی سرکاری ملازمین اور قیدی نمبرداران کی سخت اور کڑی نگرانی میں چکیوں کے عین سامنے اسی بارک میں ہی ہوتی ہے اس بارک میں کوئی اور قیدی بلا اجازت اندر نہیں جا سکتا ہے۔ ایسی بارک کا مین گیٹ ۲۴ گھنٹے بند رہتا ہے یہ بارک اونچی دیوار (کوٹ موقعہ) سے چاروں طرف گھری ہوتی ہے۔ ایسی ایک بارک کے اندر تقریباً ۱۵ چکیاں ہوتی ہیں۔ اور ہر چکی میں ایک، تین یا زیادہ سے زیادہ (رش ہوجانے کی وجہ سے) پانچ سزائے موت والے قیدی بند کئے جاتے ہیں۔ ان مجرمین کی ملاقات بھی اسی بند جگہ میں ہی ہوتی ہے۔ وارث جیل کے اندر آکر ایک خاص نگرانی میں چکیوں کے سامنے بیٹھ کر چند منٹوں کے لئے ملاقات کرتے ہیں۔ ان مجرمین کو بالکل وہی کچھ کھانے پینے کو ملتا ہے جو عام قیدیوں اور حوالاتیوں کو ملتا ہے۔ ایک ہی لنگر خانہ میں ایک ہی جگہ پکتا ہے۔ ایک ہی پارٹی سب کو تقسیم کرتی ہے۔ چکی کے اندر سوائے پانی کے اور کچھ نہیں رکھنے دیا جاتا یا دوسرا ضروری سامان جس کی قانون اجازت دیتا ہے۔ چکی کے باہر برآمدہ جو کہ بذات خود ایک چکی ہی ہے، میں رکھا جاتا ہے ضرورت پڑنے پر ملازم یا نمبردار وہ شئے سزائے موت پانے والے کو باہر سے سلاخوں والے آہنی دروازے سے پکڑا دیتا ہے۔ ایسی ایک بارک میں ایک ہی وقت میں چار ملازم اور چار ہی قیدی نمبرداروں کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ جو کہ ہر وقت پہرہ میں چوکنے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ جناب صدر! دو خدشات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان تمام سختیوں اور پابندیوں کی وجہ صرف دو احتمال ہیں۔ وہ کون سے؟ جواب حاضر ہے۔ ۱۔ فراری نہ ہوجائے۔ ۲۔ خودکشی نہ سرزد ہوجائے

مکرمی ایڈیٹر صاحب

اسلام علیکم مزاج شریف اس عریضہ کے ہمراہ ایک مراسلہ ارسال خدمت ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے تحریر کیا ہے۔ بڑے دکھوں کی کہانی ہے۔ آپ کے مؤقر جریدہ اور خصوصاً آپ کی اصلاحی و انقلابی کوششوں کا جواب نہیں۔ آپ کے ہفت روزہ کا مستقل مطالعہ رکھتا ہوں۔ میں خود بھی ایک انقلابی ہوں۔ بڑی امید سے لکھ کر آپ کی طرف روانہ کر رہا ہوں امید ہے آپ اپنے ہفت روزہ میں مناسب جگہ عنائت کرکے مناسب ترمیم کے ساتھ شائع کر دیں گے۔ خدارا۔ بڑی حسرت سے لکھا ہے کہیں ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کر دینا اگر ایسا ہوا تو تا دم آخر یہی غم دل میں لئے مر جاؤں گا کہ اس دنیا میں مظلوموں اور غریبوں کا کوئی نہیں۔ مگر نہیں نہیں! آپ کے انقلابی جریدہ سے ہمیں یہ توقع نہیں۔ آپ ضرور ہماری آواز عوام الناس اور نوکر شاہی تک پہنچائیں گے نیک امید اور شکریہ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں

ایک قیدی

نوٹ:۔ خدا جانے کس طرح اور کتنی مصیبت سے یہ خط چوری چھپے جیل سے باہر بھیجا جا رہا ہے۔ اس لئے امید ہے آپ ہماری ان تمام رکاوٹوں کو بھی مدنظر رکھیں گے اور ہماری ہر قسم کی تکلیف اور رکاوٹ کا احساس کرتے ہوئے اس مراسلہ کو ضرور شائع کریں گے۔ شکریہ

"ایک قیدی"

نذیر احمد ناجی

غزل

بڑھ رہی ہے دُوریوں سے اب مری ہمسائیگی
کیا انا مجھ کو لباسِ خود سَری پہنائے گی

حُسن بھی ہے، نُور بھی ہے، تیرگی بھی، داغ بھی
موت کو جس رنگ میں چاہو تمہیں مِل جائے گی

ہائے یہ دہکے گلابوں سی جوانی ایک دِن
باد کے پانی میں بہتی پتّی پتّی آئے گی

رہ سکے گا منظرِ اضداد برپا کب تلک
پھیل کر دُنیا کسی دن روشنی ہو جائے گی

چھوڑنا کچُھ بھی نہیں سیکھا بِپھرتی بھُوک نے
اِک سِرے سے دُوسرے تک شہر پُورا کھائے گی

جانتا ہُوں یہ ترے وعدے وفاؤں کے ہیں کیا؟
تو مجُھے پہنا کے زُلفوں کا کفن دفنائے گی

ذہن کی وادی سے اک بدلی چلی ہے دیکھئے
اب یہ پانی ریت میں یا کھیت میں برسائے گی





ضیاء سرحدی کی یادداشتیں — (۵)

ساگر کا سٹوڈیو

سیاست اور ریشہ دوانیوں کا اکھاڑہ بن گیا

ممتاز فلمساز و ہدایت کار ضیاء سرحدی نے الفتح کے لئے لکھا

جس زمانے میں محبوب کی وکن کو مِتن فلمائی جا رہی تھی ان دنوں فلمی کاروبار کی صورت آجکل کے طریقہ کار سے بالکل مختلف تھی۔ تقریباً ہر نگارخانے کی اپنی اپنی ایک مخصوص ٹیم ہوا کرتی تھی اور علاوہ ٹیکنیشنز اور جنرل اسٹاف کے، ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی۔ پرمانینٹ اور ملازمت کی بنیادوں پر۔ اپنے اپنے سٹوڈیوز کی فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔ ساگر کے عملے میں ان ایام میں، مشہور اور مقبول اداکاروں میں سبیتا دیوی، موتی لعل، کمار اور یعقوب کے علاوہ مسز شوبھنا سمرتھ، سینہہ پربھا۔ پربھا اور کرشنا کماری شامل تھیں۔ سریندرناتھ اور اروناہنوز نووارد تھے۔ اور ابھی ان کے کیریئرز کا آغاز تھا۔ اسی طرح ساگر میں مستقل طور پر کام کرنے والے کچھ ڈائریکٹرز بھی تھے۔ جن میں سے محبوب اور بادامی کے نام سرفہرست تھے۔ اور یہ دونوں ساگر کے اے کلاس کے ہدایت کار مانے جاتے تھے۔ باقی کے ہدایت کار کاروباری ضرورت کے پیشِ نظر صرف خانہ پُری کے خیال سے استعمال کئے جاتے تھے دوسرے نگارخانوں کی طرح ساگر کی تنظیم کا عملی کاروباری پہلو یہی تھا کہ تمام فنکار، مشین کار اور ہدایت کار الگ الگ ٹیموں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ اور اس طرح سے سٹوڈیو میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں قائم ہو گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ سبیتا اور موتی لعل شروع شروع میں صرف بادامی کے لئے وقف تھے اور وہ اسی کی فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔ محبوب کی بھی اسی طرح سے اپنی خاص ٹیم وجود میں آ رہی تھی۔

اپنی کامیاب فلمی ولنی کے پیش نظر یعقوب ہی واحد قسم کا ایک ایسا ایکٹر تھا جو "کامن پراپرٹی" سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں پردہ سیمیں پر بھی چونکہ پینٹنٹ اوویات کی طرح سے، ولنی اور ہیروازم کے مخصوص تصورات تھے۔ اس لئے سکرین کے یہ اداکار، انسان کم اور ولن اور ہیرو زیادہ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بیچارہ یعقوب بھی محض ایک ولن بن کے رہ گیا تھا اور چونکہ رسمی ولن کے بغیر فلم کا بننا قطعاً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ لہذا یعقوب کی موجودگی مختلف فلموں میں ناگزیر تھی۔ ٹیموں کی اس طرح کی تقسیم کی وجہ سے ساگر کا سٹوڈیو بھی باہمی سیاست اور ریشہ دوانیوں کا ایک اچھا خاصا اکھاڑہ تھا اور آئے دن طرح طرح کے شوشے ایک دوسرے کے حق میں چھوڑے جاتے تھے۔

ذہانت اور فنکارانہ صلاحیت کے لحاظ سے محبوب اگرچہ میلوں کے حساب سے دوسرے ہدایتکاروں سے آگے تھا۔ مگر اس کے باوجود ساگر کی خاص حکمت عملی کے پیش نظر، بادامی کو محبوب پر سبقت حاصل تھی اور عملاً اس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ ساگر کی حسین ترین اور مقبول ترین ہیروئن سبیتا دیوی کو محبوب کی فلموں میں کبھی کاسٹ نہیں کیا جاتا تھا۔ اور قطعی طور پر بادامی کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ فن کی دنیا میں ایسی غیر واجب اور قابل نفرت اجارہ داریاں کیوں ہیں؟ بہت سوچنے کے بعد، بادامی کی اجارہ داری کے بارے میں کچھ یہ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ بادامی کی برتری کا سبب ساگر کے فنانسر ڈاکٹر پٹیل ہیں۔ سنا تھا کہ ڈاکٹر پٹیل کا بادامی کے ساتھ غیر فطری رشتہ تھا اور اسی سبب سے ڈاکٹر پٹیل بادامی کو بنگلور سے لے کر آئے تھے اور اس کو اپنے اثر کی وجہ سے بغیر کسی ابتدائی ٹریننگ کے ڈائریکٹر بنوا دیا تھا۔ اس سے پیشتر بادامی، بنگلور میں موٹر کے کسی کارخانے میں کل پرزوں کی مرمت کا کام کیا



مشہور مذاحیہ اداکار گوپ اور یعقوب کی ایک یادگار تصویر

مشہور ہیرو موتی لعل نے بھی مہینوں تک چنے کھا کر گزارہ کیا

کرتے تھے اور وہیں ان کی ڈاکٹر پٹیل کے ساتھ جان پہچان ہوگئی تھی۔

فلمی دنیا، جس کو میں نے اپنے خیالات اور تصورات میں بہت ہی IDEALIZED کر رکھا تھا۔ عملی طور پر اس میں آنے کے بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہاں پر بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ناانصافیاں اور بدعنوانیاں نمایاں



فلم "جھانجھر" کے سیٹ پر کامنی کوشل، موتی لعل، سندر، گیتا بالی اور اوشا کرن۔ کھڑے ہونے والوں میں سونا لینی دیوی۔ دو اسسٹنٹ ۔ کے این سنگھ اور اوم پرکاش نظر آرہے ہیں۔

طور پر عام ہیں اور یہاں پر بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو مروجہ معاشرے کے انسان، زندگی کی دوسری سطحوں اور شعبوں میں کرتے رہتے ہیں۔ پردہ سیمیں کے وہ نیک اور فرشتہ صفت انسان، صرف سکرین کی حد تک نیک اور فرشتہ صفت ہیں اور سکرین سے ہٹ کے ان کو اگر بغور دیکھا جائے تو وہ بھی اپنی زندگیوں میں اتنی ہی مکروہات اور گھناؤنا پن رکھتے ہیں۔ جو غیر فلمی لوگوں میں ہم ہر صبح و شام دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی زمانے میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ فلمی انسانوں کو بھی اسی زاویئے سے دیکھنا چاہیئے جس زاویئے سے ہم زندگی کے عام کینوس کو دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بیک وقت اچھے اور برے ہیں۔ بے رحم اور بے مروت ہیں۔ بخیل اور تنگ نظر ہیں۔ غرضیکہ یہ انسان ہیں اور ان میں بھی بیک وقت روشنی اور تاریکی کے عناصر موجود رہتے ہیں۔

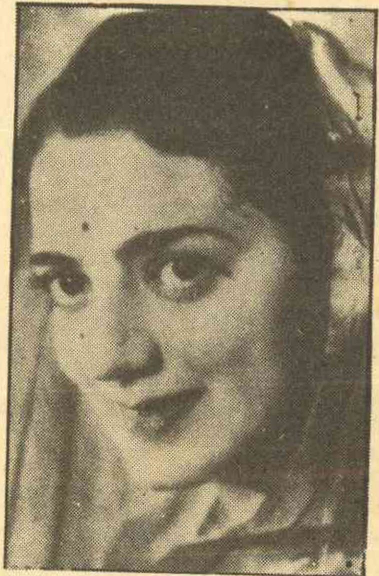
ساگر کے ان کارکنوں میں محبوب کے علاوہ جس شخص سے میں مانوس تھا وہ موتی لعل تھا۔ موتی لعل کی دلی میں گھڑی سازی کی دکان تھی اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔ فلم کا شوق ان پر بھی سوار تھا اور وہ بھی جب اپنے جنون کو قابو میں نہ رکھ سکے تو بمبئی چلے آئے۔ بمبئی پہنچنے کے بعد ان کو بھی ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ فاقوں سے اس حد تک دوچار ہوتے کہ مسلسل مہینوں تک ان کو صرف چنے کھا کر زندہ رہنا پڑتا تھا۔ اور یہ چنے بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے تھے۔ بہرحال کچھ عرصہ کے بعد کسی ذریعے سے وہ ساگر میں شامل کر لئے گئے اور اپنی ایک خاص اداکاری کی لچک کی وجہ سے فوراً ہی ہیرو بنا دیئے گئے۔ موتی لعل کے قریب آنے کی میری ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پڑھنے لکھنے کے بہت دلدادہ تھے۔ اور اکثر اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی کتاب رکھا کرتے تھے ان میں مذہبی تعصب بھی قطعاً مفقود تھا اور فن فلم سازی کو بھی وہ صرف کاروباری نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ وہ ساگر کے اسٹوڈیو میں واحد آدمی تھا جو فلم پر علمی بات چیت کرنے کے اہل تھا۔ اور فرصت کے اوقات میں وہ اکثر یہی کیا کرتا تھا۔

ساگر کے دوسرے ایکٹرز بھی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ایکٹرسوں میں صرف سبتیا پربھا اور شوبھنا تعلیم یافتہ تھیں۔ مگر عملاً یہ بھی شاذ و نادر ہی تعلیم یافتہ محسوس ہوتی تھیں۔ سبتیا پربھا کا موضوع خاص طور پر جنس کے سوا شاید ہی کبھی کچھ اور رہا ہو۔ اور وہ جب بھی گفتگو کرتی اس کے لبوں سے کوک شاستر کی بو آتی۔ عملی طور پر بھی وہ اس لحاظ سے بہت آزاد واقع ہوئی تھی۔ اور بیک وقت اس کے کئی کئی لوگوں سے جنسی رشتے ہوا کرتے تھے۔ پربھا دیوی کے متعلق کم ہی لوگ کچھ جان سکے تھے۔ وہ خاصی حد تک کم سخن اور کنارہ کش تھی۔ خاص طور پر وہ مسلمانوں سے بہت علیحدہ رہا کرتی تھی۔ اور اسی کی وجہ یہ تھی کہ اس کو خاندانی طور پر ہی یہ جذبہ تعصب ودیعت کر دیا گیا تھا۔ وہ راجگوپال کی پوتی تھی۔ جس نے رنگیلا رسول نام کی کتاب چھاپی تھی۔ اور جسکو بعد میں علم الدین شہید نے قتل کر دیا تھا۔ پربھا دیوی نے ساگر میں شامل ہونے سے پہلے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی مسلم ہدایتکار، افسانہ نگار، اور ٹیکنیشن کے ساتھ کام نہیں کرے گی۔

(باقی آئندہ)



فلمساز و ہدایت کار ـــــ محبوب



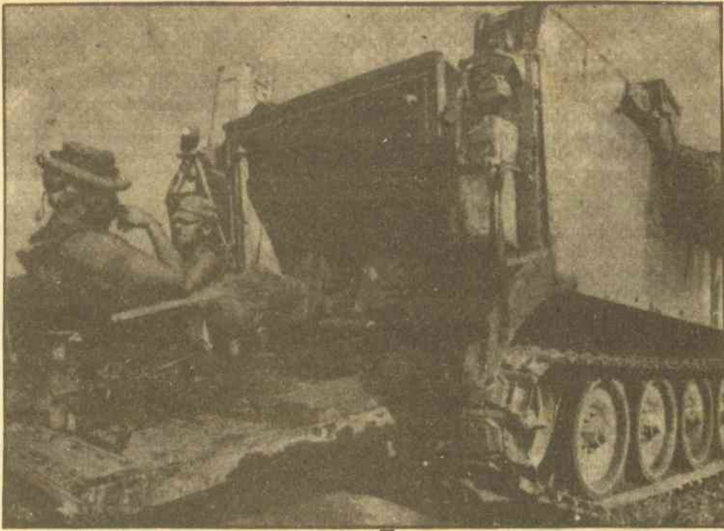
نوبرد ہیروئن سبتیا دیوی

سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ

خُدارا یہ تو بتایئے! وائٹ ہاؤس پر مقدمہ کب چلے گا؟

امریکی جنرل جنُوبی ویت نام میں مُنشیات کا کاروبار کرتا رہا

جب تک ویتنام میں امریکی رہیں گے یہی کچھ ہوتا رہے گا



ویت نام میں دو امریکی فوجی چرس کا دم لگا رہے ہیں

امریکی جنرل پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ جنوبی ویتنام میں قیام کے دوران منشیات کا ناجائز کاروبار کرتا رہا امریکی اور ویت نامی فوجیوں میں یہ وبا پھیلا کر لاکھوں روپے کا مالک بن گیا۔ ویت نام اور کمبوڈیا میں پڑی ہُوئی امریکی اور مقامی پٹھو فوجیوں کے اخلاقی زوال اور فوجی نظم و ضبط کی تباہی کا سنگین جُرم اس امریکی جنرل پر عائد ہوتا ہے۔ جس نے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس گھناؤنے کاروبار کے جال کو دُور تک پھیلا دیا۔ واشنگٹن خاموش رہا۔ اسے خاموش رہنا ہی چاہیئے تھا کیونکہ یہ آگ اُسی کی پھیلائی تھی۔ مگر جب واشنگٹن کی سرپھری اس جوالا مکھی کو سرد نہ کر سکی اور اس واقعہ کی تحقیقات کا عوامی مطالبہ زور پکڑ گیا تو وائٹ ہاؤس سے اعلان کیا گیا کہ "اس واقعہ کے علاوہ امریکی اور جنوبی ویت نام کے پٹھو فوجیوں میں منشیات کے استعمال کے بڑھتے ہوئے رجحان کی چھان بین کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی ترتیب دیگئی ہے جو بہت جلد اس بارے میں اپنی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کر دے گی۔ اس کے بعد سائنٹیفک طریقے سے اس کی روک تھام کی جائے گی اور اس جُرم میں ملوّث افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔"

چند ہفتوں کے بعد چار رکنی کمیٹی نے حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ رپورٹ کے بعض اہم حصّوں کو جان بوجھ کر عوام سے خفیہ رکھا گیا کیونکہ ان سے امریکی حکمت عملی خود ننگی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود رپورٹ کے جن حصّوں کو عوام کے لئے قابل اشاعت سمجھا گیا۔ ان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ امریکی سامراج ایشیائی عوام کو جس آگ میں جلانا چاہتا تھا۔ اس آگ میں تو اس کا اپنا گھر جل رہا ہے۔ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے ایک امریکی سپاہی نے کہا "چرس پینا جرم ہے۔ فوجی ضابطے اور نظم و نسق کے خلاف ہے تو دوسروں کا گھر جلانا اور بلاوجہ امن پسند لوگوں کو جنگ کا ایندھن بنانا بدترین جُرم ہے۔ بے شک آپ ہم پر مقدمہ چلایئے، ہمارا کورٹ مارشل کیجئے، ہمیں گولی سے اُڑا دیجئے، مگر خدارا یہ تو بتا دیجئے کہ وائٹ ہاؤس والوں پر کب مقدمہ چلے گا۔ جنہوں نے ہمیں ایک ایسی جنگ میں اُلجھا دیا، جس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور ایک اجنبی مُلک میں جدید اور اعلےٰ قسم کے ہتھیاروں سے بیگناہ انسانوں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ ہمارا یہ ذہن سوچتا ہے۔ سُلگتا ہے، جلتا ہے مگر چرس کا ایک لمبا دم ہمارے اس جلتے ہوئے ذہن کو غنودہ اور تاریک کر دیتا ہے۔"

رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ گواہ کے چہرے پر شدید تلخی کے تاثرات تھے۔

تحقیقاتی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ امریکی فوجیوں میں منشیات کا استعمال خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ فوجی ضابطوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ فوج کے اعلےٰ عہدیدار بھی اس میں ملوّث ہیں۔ ان کی صلاحیتیں مشکوک ہو چکی ہیں۔ رپورٹ مرتب کرنے کے دوران بے شمار امریکی فوجیوں سے انٹرویو لیا گیا۔ "وہ اپنے موجودہ حالات سے سخت بیزار اور متوحش ہیں۔ ان میں امریکی حکمت عملی، جنگ اور فوجی کارروائی کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنا گھر بار بیوی بچّے، ماں باپ اور رشتہ داروں کی جدائی کا غم بھُولنے کے لئے کثرت سے شراب نوشی کرتے ہیں۔ اور جب اس سے بھی ان کا جی نہیں بھرتا تو اپنے ذہن سے خیالات بھُلانے کے لئے "آن ڈیوٹی" خطرناک قسم کی نشہ آور ادویات استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات ملٹری آپریشن کے دوران نشہ کی پینک میں ہوتے ہیں۔

سائیگان کا شہر، ہوٹل، بار اور کلب میں ان کا رات گئے تک جمگھٹا رہتا ہے۔ شراب، رقص، مدہوشی، مار پیٹ اور قتل کے واقعات معمول بن گئے ہیں۔ گذشتہ ماہ سائیگان کے ایک ہوٹل میں ایک امریکی فوجی رات گئے تک شراب پیتا رہا۔ اُسے نو بجے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ مگر وہ اس قدر نشہ میں تھا کہ جب بھی اُٹھنے کی کوشش کرتا لڑکھڑا کر گر جاتا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں اول فول بکتا رہا۔ "میں لڑنے نہیں جاؤں گا، میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں، کس کے لئے لڑوں، کس سے لڑوں، وائٹ ہاؤس، نکسن تم قاتل ہو، تم پر کورٹ مارشل ہو گا ——

ہاہا ——"

امریکی فوجی سائیگان کے شراب خانوں میں نکسن کو گالیاں دیتے ہیں

نعیم آروی

ہوٹل میں شور شرابا اور ہنگامہ کی آواز سُن کر سیکورٹی والے پہنچ گئے۔ اندر ایک قیامت کا منظر تھا۔ کچھ لوگوں نے مدہوش امریکی فوجی کو اُٹھانا چاہا تو وہ اکڑ گیا۔ اور آپس میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی کرسیاں چلنے لگیں۔ گلاس ٹوٹنے لگے۔ کاؤنٹر ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا۔ ہوٹل کی دیواروں پر لگے ہوئے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ ہوٹل میں موجود ہر آدمی دوسرے سے گتھم گتھا تھا۔ سیکورٹی والوں نے مداخلت کی تو بدمست فوجی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس قیامت کے ہنگامے اور افراتفری میں کسی نے چاقو نکال کر مدہوش فوجی کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ ایک لمبی اور ہولناک چیخ سے ہوٹل کا ہال لرز کر رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد سیکورٹی والوں کی مزید کمک پہنچ گئی۔ اور کسی نہ کسی طرح صورت حال پر قابو پا لیا گیا۔ معاملہ رفع دفع ہوتے ہی ہوٹل والے دوبارہ اپنے کام میں کچھ اس طرح منہمک ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ الٹی میزیں درست کی گئیں۔ کرسیاں دوبارہ ان کی جگہوں پر رکھی گئیں۔ شیشے کی کرچیاں اُٹھا کر باہر پھینک دی گئیں۔ اور پھر دوبارہ پیانو پر "رقص کرو، عیش کرو" کی موسیقی شروع کر دی گئی۔

ہوٹل والے نے بتایا۔ "کوئی خاص بات نہیں ایسا تماشہ روز ہی ہوتا ہے۔ جب تک ہمارے امریکی بھائی یہاں رہیں گے، یہی کچھ ہوتا رہے گا۔"

امریکی اور مقامی پٹھو فوجیوں میں جوں جوں منشیات کے استعمال کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اسی تناسب سے جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ قتل، اغوا، عصمت فروشی، منشیات کے ناجائز کاروبار اور ان کے خُفیہ اڈّوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جنوبی ویت نام اور سائیگان کے محب وطن افراد اپنے ملک کی زمین پر امریکی سامراج کی پھیلائی ہوئی دہشت گردی اور گھناؤنے کاروبار سے سخت پریشان ہیں۔ اکثر وہ ان اخلاقی برائیوں سے تنگ آ کر شمالی ویت نام بھاگ جاتے ہیں۔ یا پھر حریت پسندوں میں شامل ہو کر امریکی سامراج اور اس کے پٹھو تنخواہ دار فوجیوں کو ہلاک کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض انتہائی

چالیس ہزار فوجیوں میں سے دس ہزار چرسی نکلے

خطرناک مہم میں امریکی اور ویت نامی فوجیوں کو آنکھ بند کر کے جھونک دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ بعد میں شدید جانی اور مالی نقصانات کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فوجی یونٹوں میں تجربہ کار اور اچھے کیریکٹر کے عہدیداروں کی شدید قلت رہتی ہے۔ بدکردار افسروں کی دیکھا دیکھی چھوٹے چھوٹے فوجی بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

امریکی کانگریس کے ایک ممبر رابرٹ ایچ اسٹیل اور امریکی افواج کے سابق سیکرٹری نے انکشاف کیا کہ ویت نام میں موجود ۱۵ فی صد سے لے کر ۲۰ فیصد فوجی ہیروئن استعمال کرتے ہیں یہ تعداد ۳۹ ہزار سے ۵۵ ہزار تک پہنچتی ہے۔ اس تعداد پر بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کچھ لوگ کم بتاتے ہیں اور کچھ ماہرین اس سے زیادہ تعداد پر مصر ہیں۔ صدر نکسن کی تحقیقاتی کمیٹی کے ایک ممتاز ماہر ڈاکٹر جیروم جیف نے ویت نام سے واپس آنے والے فوجیوں کے پیشاب کا کیمیاوی تجزیہ کیا۔ اس کا نتیجہ غیر معمولی اور انتہائی حیرت انگیز برآمد ہوا۔ تقریباً ۳۹ ہزار چار سو پانچ فوجیوں کا ٹسٹ کیا گیا۔ جس میں ۸ ہزار ۹ سو ۰۷ فوجی منشیات کے عادی بتائے گئے۔ کانگریس کے ممبر اسٹیل نے پہلے جیف کے ان اعداد کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر کے یہ اعداد گمراہ کرنے والے ہیں۔" مگر جب یہ اعداد وائٹ ہاؤس کے عہدیداروں کے سامنے رکھے گئے اور ان کی باقاعدہ چھان بین کی گئی تو جیف کے ان اعداد کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا گیا۔ "اس سے زیادہ صحیح اور قابل قبول اعداد ہمارے پاس نہیں۔"

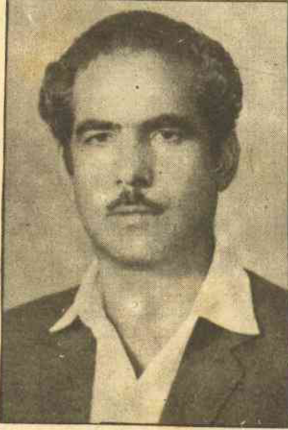
ان اعداد میں ان ۱۲ ہزار فوجیوں کو شامل نہیں کیا گیا جو منشیات اور ادویات کے مختلف جرائم میں ماخوذ ہیں یا ان کی ایک بڑی تعداد متعدد اسپتالوں میں زیر علاج ہے۔

امریکی سامراج اپنے ہاتھوں لگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہے۔

روزنامہ "جنگ" میں راسپوٹین کی حمایت میں پیر علی محمد راشدی کے مضمون پر رفیق چوہدری کی تنقید

احوالِ واقعی

پیر علی محمد راشدی — اور رسوائے زمانہ راسپوٹین


صاحبِ مضمون - رفیق چوہدری

روزنامہ جنگ ۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء میں پیر علی محمد راشدی کا مضمون بعنوان "تاریخ یورپ کی بدنام شخصیتیں ـــــ روس کا راسپوٹین" شائع ہوا۔ پیر علی محمد راشدی کی شخصیت کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ کثیر الاشاعت اخبار میں مسلسل لکھنے سے وہ راسپوٹین جتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ دنیا کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے قلمی جہاد کر رہے ہیں۔ وڈیرہ اور نوکرشاہی کے گرتے ہوئے بتوں کو سہارا دینے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کوششوں نے انہیں وڈیروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور "اسلام پسندوں" کا محبوب ادیب اور دانشور بنا دیا ہے۔ پیر علی محمد راشدی کا یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موصوف اس مضمون سے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلاب کے اصل محرکات پر پردہ ڈال کر عوام کے ذہنوں میں الجھاؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے حقوق کی جدوجہد سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم اور جبر کے سامنے سینہ سپر نہ ہوں۔ وقت کے راسپوٹینوں کو برگزیدہ ہستیاں مان کر ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

پیر راشدی، نادر شاہ افشار، کرامویل، مسولینی خاندان زارشاہی اور راسپوٹین کی لاشوں کی بے حرمتی کے شاکی ہیں۔ اُنہیں دُکھ ہے کہ راسپوٹین کے مرنے کے آٹھ ماہ بعد اس کی لاش نکال کر جلادی گئی۔ اور راکھ فضا میں بکھیر دی گئی۔ مضمون کی طویل اور فلسفیانہ تمہید کے بعد اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انسان کی کینہ پروری اور خبثِ باطنی کی ایک اور قسم ہے جو اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے اس کا مظاہرہ کبھی کبھی "اہل قلم" اور مؤرخ کرتے رہتے ہیں یعنی وہ لوگ اپنے قلم سے کام لیتے ہیں جو دوسرے لوگ اپنے دشمنوں کے بارے میں تلوار اور کدال سے کام لیتے رہے ہیں۔ ...... اخلاقی اور معیار انسانیت کے لحاظ سے دونوں کے کیریکٹر اور عمل میں کوئی فرق نہیں البتہ اگر یوں کہا جائے کہ قلم سے قبریں اکھاڑنے والے لوگ پہلی قسم کے گورکنوں کے مقابلے میں زیادہ خراب ہوتے ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔...... جو خرابی قلم کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اس کا اثر دوامی ہوتا ہے۔ یعنی ان کی تحریریں صدیوں تک زندہ رہتی ہیں، پڑھی جاتی ہیں۔ اور جن لوگوں کو انہوں نے اپنی تحریر سے ایک مرتبہ بدنام کر دیا ہے ان کی بدنامی کا سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہتا ہے۔ اس لحاظ سے تلوار چلانے والوں سے قلم چلانے والوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔"

یہ سطور پڑھ کر ذہن میں سب سے پہلے اس مولوی کا تصور آتا ہے جو اپنے حلوے مانڈے کی خاطر سیدھے سادھے لوگوں کو مذہب کے نام پر ڈرا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ "آخرت کا حساب" "عذابِ جہنم" یا پھر "اللہ والوں" کی خدمت کے صلے میں فردوسِ بریں کی نوید سناتا ہے۔ اس کے بعد دریا کے اُس ملاح کی تصویر اُبھرتی ہے جس کے حقے کا پانی کبھی تازہ نہیں ہوتا۔ جس طرح ملاح کو ہر دم پانی سے بہتے ہوئے پانی سے اپنا حقہ تازہ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح پیر راشدی اور اس قبیل کے ادیبوں کی کیفیت ہے کہ وہ علم کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے کنارے بیٹھے ماضی و حال کے مشاہدات و تجربات اور صداقتوں کی لہروں کو اُٹھتے دیکھتے ہیں۔ ان تجربوں اور مشاہدوں سے پھوٹتی مستقبل کی ضیا کو دیکھتے ہی گھبرا جاتے ہیں۔ اور آنکھیں موند لیتے ہیں۔ ورنہ ایک ادیب، فن کار اور دانشور کبھی بھی انسانیت کے خلاف سازش نہیں کرتا۔ اخلاق، سچائی اور انسانیت کے اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کرتا۔ پیر راشدی اور اس قبیل کے دوسرے ادیبوں نے ہمیشہ اُبھرتے ہوئے سورج کی پوجا کی ہے۔ نوکرشاہی، وڈیرہ شاہی اور جبر و استحصال کا ساتھ دیا ہے۔

پیر راشدی نے اپنا مافی الضمیر اُگلنے کے لئے راسپوٹین کا کردار منتخب کیا ہے۔ اس انتخاب کی داد دیجئے۔ راسپوٹین جسے دنیا کے تمام مؤرخوں نے بدترین کردار کا مالک اور شیطانی اوصاف کا مکمل مجسمہ قرار دیا ہے۔ جسے بدی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ پیر علی محمد راشدی نے انسان دشمنی کے طفیل راسپوٹین میں اعلیٰ صفات ڈھونڈ نکالی ہیں۔ اور ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے تاکہ عوام و خواص میں ان کی تحقیق کا رُعب بیٹھے۔ وہ راسپوٹین کے مذہبی فلسفہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اللہ تعالےٰ گناہ بخشنے والا ہے، انسان اگر گناہ نہ کرے تو اللہ تعالےٰ کو گناہ بخشنے کا موقع نہیں ملتا لہٰذا انسان کو زیادہ سے زیادہ گناہ کرنے چاہئیں تاکہ اللہ تعالےٰ کو زیادہ سے زیادہ مواقع گناہ بخشنے کے ملتے رہیں۔"

میرا خیال ہے پیر راشدی اپنا بھانڈا پھوڑتے سے بھی نہیں چوکے۔ راسپوٹین سے قلبی لگاؤ کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دلوں کا بھید جاننے والا تو وہی ہے۔ اپنے آقا ولی نعمت اور استحصالی طبقوں کو خوش کرنے اور تاریخ کے دھارے کو روکنے کی سعی لاحاصل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پیر صاحب کے نزدیک راسپوٹین روس کی ایک برگزیدہ شخصیت تھے

"راسپوٹین کا قتل دسمبر ۱۹۱۶ء میں واقع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمی جنگ جاری تھی۔ روس کی افواج جرمنی اور آسٹریلیا کے محاذوں پر شب و روز لڑ رہی تھیں۔ اور پسپا ہو رہی تھیں۔ لڑائی کی وجہ سے نظام رسل و رسائل میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ خوراک کی چیزیں شہروں تک پہنچ نہیں پاتی تھیں اور بڑے بڑے شہروں میں عوام کو روٹی نہیں مل رہی تھی۔ شروع مارچ ۱۹۱۷ء میں دارالحکومت پیٹروگراڈ میں روٹی کے مسئلے پر بلوے بھی ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کے ساتھ فوج نے بھی بغاوت کر دی۔ بالآخر بادشاہ کو معزول اور گرفتار کر کے محل کے اندر نظر بند کر دیا گیا۔ مارچ سے اکتوبر تک عام افراتفری کا عالم رہا۔ اکتوبر میں بالشویکوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور بالشویکوں یا کمیونسٹ دور کی ابتدا ہوئی۔"

ساتھ ہی لکھتے ہیں۔ "راسپوٹین مرنے سے پہلے پیشن گوئی کر گیا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں زار کی حکومت قائم رہے گی۔ ایک روز میرے دشمن مجھے قتل کر دیں گے اور میرے قتل ہونے کے چھ ماہ کے اندر اندر زار کی بادشاہی بھی ختم ہو جائے گی۔ راسپوٹین کی پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ دسمبر میں وہ قتل ہوا، اور مارچ میں زار کی بادشاہی جاتی رہی۔"

بالفاظ دیگر پیر راشدی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب شکست خوردہ فوجیوں اور بھوکے مزدوروں کے بلووں کا نتیجہ تھا۔ اور سب سے زیادہ راسپوٹین کی بد دعا اور اس کے قتل کی پاداش میں روس کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ اگر راسپوٹین قتل نہ ہوتا تو بلوے ہوتے اور نہ یہ "حادثہ جانکاہ" ہوتا اور نہ روس میں کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہوتی۔ اس قسم کے بچگانہ مفروضات سے وہ حضرات تو دل بہلا سکتے ہیں جو تاریخ سے نابلد ہیں۔ مگر جب پیر صاحب ایسے گرُوگ لکھاری یہ بات کریں تو اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور ان کے پیچھے پوشیدہ عوامل اور محرکات کا جائزہ لینا چاہیئے

کیا نہیں جانتے کہ دنیا میں اپنی طرز کا یہ پہلا انقلاب قہرمانی طاقتوں کے ظلم و جبر کی چکی میں پستے ہوئے مظلوم اور کچلے ہوئے عوام کی مسلسل جد و جہد کا نتیجہ تھا جس کی قیادت ایک مضبوط اور مربوط پارٹی کے ہاتھوں میں تھی۔ اس پارٹی نے سائنٹیفک کمیونزم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہمیشہ عوام کی صحیح رہنمائی کی اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔ اس کے لیڈروں نے کبھی عوام کو دھوکا نہیں دیا۔ زارشاہی پر انقلابیوں کی فیصلہ کن فتح کے سبب کمیونسٹ پارٹی کا حکومت بنانا ایک سائنسی عمل اور منطقی نتیجہ تھا جسے کسی پیر کی دعاؤں اور بد دعاؤں سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اور نہ ہی کسی شیطان کی پیشن گوئی اور اس کا قتل اس پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

پیر علی محمد راشدی نے راسپوٹین پر لگائے جانے والے پانچ الزامات (۱) زانی، شرابی، اوباش (۲) غلط مذہبی فلسفہ (۳) سیاسی اور انتظامی امور میں دخل اندازی (۴) محل سے وابستگی (۵) راسپوٹین کے وہ مشورے جن پر عمل پیرا ہو کر بادشاہ نے نقصان اُٹھایا"، کی صفائی میں جو کچھ کہا ہے وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے، لکھتے ہیں:

(۱) "کیا یہ گناہ صرف راسپوٹین سے سرزد ہوئے یا جس سوشل طبقہ سے راسپوٹین کا تعلق تھا اس طبقہ کا تقریباً ہر چلتا پھرتا فرد، یہ اور ان سے بدتر گناہ کر رہا تھا۔

(۲) راسپوٹین کا مذہبی عقیدہ بھی یقیناً غلط تھا۔ مگر کیا ایسے ملّاتی فرقے کہیں اور پیدا نہیں ہوتے۔ کیا مذہب کے نام پر راسپوٹین کے علاوہ اور لوگ کم گناہ کرتے رہے تھے۔

(۳) شاہی محل سے وابستہ ہونے کے بعد سیاسیات میں کون دخل نہیں دیتا۔

(۴) بادشاہ بدنام ہوا مگر کیا روس کا یہی ایک بادشاہ تھا جو اس قدر بدنام ہوا۔ کیا "آئیوان ٹیرِیبل" "پیٹر" اور ملکہ کیتھرائن دوم نیک نام تھے؟ اگر روس کے حکمران بدنامی کی بنیاد پر بدلے جاتے تو ان حکمرانوں کو کیوں نہیں نکالا گیا اور ان کے خلاف کیوں نہیں انقلاب برپا ہوا۔

۵۔ اگر روس جرمنی کے خلاف عالمی جنگ میں شرکت نہ کرتا تو وہ انقلاب سے بچا رہتا۔ مگر کیا جنگ میں شریک ہونے کا مشورہ راسپوٹین نے دیا تھا—؟ راسپوٹین جنگ کے خلاف تھا۔ اس ایک معاملہ میں بادشاہ نے راسپوٹین کی نہ سنی اور اس کی سزا پائی"۔

دیکھا آپ نے، راشدی، راسپوٹین کو بے گناہ اور فراست کا پتلا ثابت کرنے میں کس قدر بے قرار اور بے تاب ہیں۔ کیا جواب ہے، کیا صفائی ہے، پیر راشدی آپ کی صفائی کا جواب نہیں۔ دراصل پیر راشدی کہنا چاہتے ہیں (۱) گناہ کون نہیں کرتا۔ (بلکہ ضرور کرنا چاہیئے) بے عیب تو اس کی ذات ہے، پھر واویلا کیسا؟ (۲) دنیا میں سینکڑوں ملّاتی فرقے گزرے ہیں اگر راسپوٹین نے ایک فرقہ پیدا کر دیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مذہب کے نام پر صرف راسپوٹین نے ہی گناہ نہیں کیا بلکہ پیر راشدی اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگ آج بھی مذہب کے نام پر بڑے بڑے فراڈ کھیل رہے ہیں۔ اپنے ہاں تو تھوک کے حساب سے ہوتے ہیں۔ راسپوٹین کی ایک فوج ظفر موج قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے (۳) پھر محلات سے وابستہ ہو کر سیاست میں دخل نہ دینا بھلا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اپنے راشدی صاحب کو بھی اس کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔ بلکہ انہیں تو اس کا کچھ زیادہ ہی چسکا لگ گیا ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

چوتھے الزام کے جواب میں کیسی دلیل اور منطق سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں "کیا روس کے فلاں فلاں حکمران بدنام نہ تھے۔ پھر ان کے وقتوں میں انقلاب برپا کیوں نہیں ہوا؟ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیر راشدی کا علم اور مشاہدہ یہ بات نہیں بتاتا کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ پانچویں الزام کے سلسلے میں موصوف کا موقف ہے کہ راسپوٹین جنگ کے خلاف تھا اور بادشاہ نے اس کی بات نہ مان کر منہ کی کھائی۔ سلطنت گنوائی اور لوگوں کو خواہ مخواہ کمیونسٹوں کے چنگل میں گرفتار کروا دیا۔

پیر راشدی صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ زارینہ کی تمام تر ہمدردیاں قیصر جرمنی کے ساتھ تھیں بعض مؤرخوں نے اُسے جرمنی کی جاسوسہ بھی بتایا ہے۔ راسپوٹین سے زارینہ کا جو تعلق تھا وہ سب پر آشکارا ہے۔ زارینہ کو جرمنی سے ہدایات ملتی تھیں راسپوٹین ان کے مطابق عمل کرتا تھا۔ محل اور سیاست میں عملی دخل ہونے کی وجہ سے جوڑ توڑ کرتا تھا۔ زارینہ

بادشاہ راسپوٹین کی بات مان لیتا تو انقلاب برپا نہ ہوتا

اور راسپوٹین ایسا کوئی کام کرنا نہیں چاہتے تھے جو جرمنی کے مفاد کے خلاف ہو۔ اس لئے وہ شروع ہی سے جرمنی کے خلاف جنگ میں حصّہ لینے کی مخالفت کرتا تھا۔ اور جب روس کے لئے جنگ میں شرکت ناگزیر ہوگئی تو راسپوٹین نے ایک طرف تو اپنے مذہبی کلاس کیریکٹر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بددعاؤں اور پیشین گوئیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا اور دوسری جانب زارینہ نے راسپوٹین اور اپنے / فوجی افسروں کے ٹولے کی مدد سے روسی فوجیوں کی پسپائی کے اسباب پیدا کئے۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر روس میں انقلابی تحریک عروج پر تھی جس کی قیادت کمیونسٹ پارٹی اور اس کے سربراہ لینن کے ہاتھ میں تھی۔ اشتراکی نظریات کی مقبولیت تھی کمیونسٹ پارٹی کا ہاتھ وقت کی نبض پر تھا۔ اس نے موقع ملتے ہی معاشرے کے ناسوروں کو جڑ سے کاٹ دیا۔

اب پاکستان میں کچھ لوگ دنیا کے بدترین شخص راسپوٹین کو اپنا آئیڈیل بنانا چاہتے ہیں تو بے شک بنا ہیں۔ مگر انہیں تاریخ کو مسخ کرنے اور گھناؤنی شخصیت کو پارسا کے روپ میں دانش وری اور علم و فراست کے پھندے ٹانک کر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آخر میں مجھے راسپوٹین کی کرامات و علمیات جن کا ذکر پیر راشدی نے بڑی صفائی سے کیا ہے، کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

پیر راشدی لکھتے ہیں:

"اس کی (راسپوٹین) کی کرامات اور عملیات کا خوب شہرہ ہوا۔ رفتہ رفتہ بات شاہی محل تک پہنچ گئی۔ وہاں بادشاہ کا بیٹا بیمار تھا۔ لڑکے کی ماں یعنی ملکہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ راسپوٹین سے رجوع کرے۔ ملکہ نے راسپوٹین سے درخواست کی۔ راسپوٹین نے دعا کی۔ لڑکے کی تکلیف میں یک لخت تخفیف ہوگئی اس کے بعد کیفیت یہ رہی کہ جب کبھی لڑکے پر بیماری کا حملہ ہوا تو راسپوٹین کی دعا سے عارضی طور پر افاقہ ہوگیا دو چار سال کے تجربہ سے بادشاہ اور ملکہ کو یقین ہوگیا کہ ان کے بیٹے کی زندگی صرف راسپوٹین کی دعاؤں پر منحصر ہے اگر راسپوٹین نہیں رہتا تو ان کا بیٹا بھی زندہ نہیں رہتا۔"

پیر علی محمد راشدی نے راسپوٹین کو صاحب کرامات ثابت کر کے حقائق سے آنکھیں موند کر غلط بیانی کی ہے مجھے اس بارے میں صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ جب راسپوٹین پہلی مرتبہ بیمار شہزادے کے کمرے میں داخل ہوا، یہی اس کی زارینہ اور بادشاہ سے پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کا منظر کچھ یوں ہے "محل کے ایک بڑے کمرے کے ایک کونے میں زار اور زارینہ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہیں۔ سامنے دوسرے کونے میں ایک چھپر کھٹ پر بیمار شہزادہ نیم بیہوشی کے عالم میں پڑا ہے۔ چھپر کھٹ کی پائنتی کی جانب منقش لکڑی کا تختہ لگا ہوا ہے۔ زار اور زارینہ جس کونے میں کھڑے ہیں وہاں سے لکڑی کے تختہ کے سبب بیمار شہزادہ اچھی طرح نظر نہیں آ رہا ہے۔ کمرے کا بڑا دروازہ کھلتا ہے۔ راسپوٹین ایک لمبا

زارینہ کی تمام ترہمدردیاں قیصرِ جرمنی کے ساتھ تھیں

اور کشادہ فرغل پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ کوئی تعظیم نہیں دیتا۔ سیدھا ملکہ کے پاس جاتا ہے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا ہے۔ پھر زار کے گال پر بوسہ دیتا ہے اور بیمار شہزادے کے پلنگ کی طرف چل دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ ملکہ اور بادشاہ بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ شہزادے کے پلنگ کی طرف جاتے ہوئے راسپوٹین کی پشت زار اور زارینہ کی طرف ہے۔ کشادہ فرغل اس کے وجود اور کمرے کے سامنے کے منظر کو چھپائے ہوئے ہے۔

راسپوٹین جھک کر شہزادے کو دیکھتا ہے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ عین اسی وقت اس کے فرغل کی آستین سے ایک چھوٹی سی شیشی برآمد ہوتی ہے۔ وہ نیم بے ہوش شہزادے کے منہ پر اس دوا کے چند قطرے گراتا ہے۔ اس وقت راسپوٹین پلٹ کر دیکھتا ہے۔ زار اور زارینہ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ راسپوٹین شہزادے کے ماتھے سے ہاتھ ہٹا لیتا ہے اور سیدھا کھڑا ہو کر کچھ بڑبڑانے لگتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد شہزادہ آنکھیں کھول دیتا ہے اور طبیعت بحال ہونے لگتی ہے۔" اس کے بعد جب کبھی بھی راسپوٹین ناراض ہو کر یا اپنی عیاشی کے لئے چند دنوں کے لئے غائب ہوتا تو شہزادے کی طبیعت بگڑنے لگتی۔ شہزادے کی طبیعت بگڑنے کا راز اب کوئی پوشیدہ امر نہیں رہا۔ جو نرس شہزادے کی تیمارداری پر مقرر تھی وہ راسپوٹین کے نظرِ کرم کا شکار تھی۔ راسپوٹین کے محل سے نکلتے ہی وہ ایک خاص دوائی شہزادے کو پلا دیتی جس سے اس کی طبیعت بگڑنے لگتی۔ اس دوا کا توڑ صرف راسپوٹین کے پاس تھا۔ چنانچہ نرس اور راسپوٹین کی ملی بھگت سے یہ ڈرامہ عروج حاصل کرتا گیا اور زار و ملکہ آخری وقت تک اندھیرے میں رہے۔

اب پیر راشدی نے یہ ڈرامہ پچاس پچپن برس بعد اپنی قبیل کے ان ناول نگاروں کے انداز میں سنانا شروع کر دیا ہے۔ جو اپنی تاریخ کی بہترین شخصیتوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ سستی شہرت اور ذاتی مفاد کی خاطر معاشرے کے ناپختہ ذہنوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور غیر قانونی واقعات کو تاریخی بنا بنا کر موٹی موٹی کتابوں کے ڈھیر لگا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول نگار تاریخ کے اچھے بھلے کیریکٹروں کو اپنے قلمی جوش و خروش کے ساتھ نظرباز، حسن پرست اور عاشقِ زار بنا دیتے ہیں۔ جو بعض اوقات اغوا قسم کی وارداتوں سے بھی باز نہیں آتے۔ ادھر اپنے پیر راشدی صاحب نے اب اپنی لائن بدل لی ہے۔ اب وہ 'بدوں' کو اچھا اور نیک بنا کر پیش کیا کریں گے۔ بہرحال ان سب نے مل جل کر تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

یہ کہانی ایک حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔ یہ کواپریٹو ۱۹۵۲ء میں وانگ گگ ژنگ اور ڈوھونگ نے شروع کیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں چیئرمین ماؤ نے اپنے ایک مضمون میں اس کواپریٹو کی مثال کو سارے ملک کے لئے قابلِ اتباع قرار دیا تھا۔

افسانہ

کنگال

ترجمہ: ڈاکٹر انیس عالم

ہوپچی کے ضلع میں ایک پہاڑ کی وادی میں چھانگ بو کا گاؤں آباد ہے۔ جو ہمیشہ اپنی غربت بنجر پہاڑیوں کم پانی والے کم زمین اور غریب لوگوں کی وجہ سے مشہور رہتا۔ بنجر پہاڑیاں جو ریت کا انبار تھیں ہلکی بارش پتھروں اور ریت میں اتنی تیزی سے جذب ہو جاتی تھی کہ چند دن کی تیز دھوپ سے کھیت سوکھ جاتے۔ اور اگر بارش دھواں دار ہو تو پہاڑی نالے اتنی تیزی سے چلتے کہ کھڑی فصلیں گر جاتیں یا پانی میں بہہ جایا کرتیں۔ ضلع پہاڑی تھا۔ اور زمین ریتلی جس کی وجہ سے پیداوار بھی بہت کم تھی۔ گاؤں میں ۴۵ گھرانے تھے لیکن چار میں تین غریب کسانوں یا کھیت مزدوروں پر مشتمل تھے۔ اور کئی درجن گھرانوں کو تو بھیک پہ گذارہ کرنا پڑتا تھا

آزادی کے بعد اصلاحات اراضی ہوئیں اس طرح غریب کسانوں کو کچھ زمین مل گئی۔ لیکن اوزاروں بیلوں کھاد اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے اچھی فصل اگانا اور خشک سالی و سیلاب کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ کئی قدیم غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں کو اپنی نئی ملی ہوئی زمین پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیئے بیچنی پڑی

گاؤں میں جو پارٹی ممبر تھے وہ رات دن اپنے دماغ لڑاتے کہ اس مشکل صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے۔ ان میں سے ایک وانگ گگ ژنگ ایک لمبا تڑنگا اور ہٹا کٹا جوان کسان تھا۔ اس نے سوچا کہ ۱۹۵۴ء کی قحط سالی کی وجہ سے گاؤں والوں کو سردی کا موسم گذارنا مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ پھر حکومت سے امداد مانگیں۔ رضاکار کوریا میں لڑ رہے ہیں۔ اور ہم حکومت کی مدد کرنے کے بجائے ہر سال تیس ٹن غلہ اور امدادی قرضوں کے علاوہ ایک سو اونی لباسوں کی درخواست کرتے ہیں۔ اب اس سلسلے کو ختم ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم آخران بنجر پہاڑیوں کو لہلہاتے کھیتوں میں کس طرح تبدیل کریں؟ ہم کنگال لوگ کس طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔؟

اس کے خیالات کا تسلسل دروازے کی دستک سے ٹوٹ گیا۔ اندر آنے والا نوجوان پارٹی کا ایک صاف گو اور دو ٹوک بات کرنے والا ممبر ڈوہونگ تھا۔ "تم نے سُنا وانگ لائی ینگ اپنا کھیت گوُر وئی کو بیچ رہا ہے "کیا"؟ وانگ چلایا۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لائی ینگ کا کنبہ بڑا ہے۔ وہ اور اس کا محنتی لڑکا بھی دو وقت کی روٹی مشکل سے پیدا کر سکتے ہیں لیکن زمین تو کسان کی زندگی ہے اسے بیچ کر وہ کس پہ زندہ رہیں گے۔؟ جاؤ ڈوہونگ! اس سے کہو وہ زمین نہ بیچے ہم سب جمع جوڑی کر کے اس کی مدد کریں گے"۔

"کوئی فائدہ نہیں میں پہلے ہی اسے سمجھانے کی کوشش کر چکا ہوں"۔ ڈوہونگ نے جواب دیا۔ "لائی ینگ کہتا ہے کہ تم بھی میری ہی طرح ہو۔ میری مدد کیسے کرو گے؟ اگر میں اب بھی کسی طرح گذارہ کر لوں تو اگلی فصل تک کسی طرح بھی گذارہ نہیں کر سکتا۔ میں زمین بیچ کر اب سلسلے کو ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں پتہ ہے دانا لائی ینگ اور کیا کہتا ہے۔ اس کی باتوں سے میں بہت پریشان ہوا۔ لائی ینگ کہتا ہے کہ "زمیندار ہونے کے لئے تمہیں خوش قسمت پیدا ہونا چاہیئے تم کنگالوں کی قسمت میں زمیندار ہونا ہی نہیں بکھار تمہاری زمین کے ٹکڑے تمہاری ہڈیوں پر گوشت کبھی نہیں چڑھائیں گے"۔

لائی ینگ کی باتوں سے وانگ گگ ژنگ کو خطرے کی جھلک نظر آئی۔

"لائی ینگ سے کہو کہ زمین نہ بیچے" وانگ نے ڈوہونگ سے دوبارہ کہا "ہم اس کو مشکل وقت سے نکال لائیں گے میں جا کر ضلع کے پارٹی سکریٹری سے مشورہ کرتا ہوں میں یہ نہیں چاہتا کہ کھیت مزدوروں اور غریب کسانوں کی موج غفار پھر سے پیدا ہو جائے اور نہ ہی کوئی جاگیردارانہ طبقہ پیدا ہونا چاہیئے ورنہ پھر سے زرعی اصلاحات لانا پڑینگی"

وانگ اسی رات ضلع کے پارٹی سیکرٹری کے پاس گیا اور اگلی صبح لوٹ آیا۔ ڈوہونگ کو اپنی گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ ضلع کے پارٹی کارکن زرعی کوآپریٹو قائم کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ سیکرٹری کاؤ نے کہا کہ "ہم غریب ایک ساتھ مل کر زرعی کوآپریشن پر عمل کریں۔ کوآپریٹو میں ہم اپنی طاقت جمع کر سکتے ہیں۔ زمین سے سونا اگا سکتے ہیں اور پھر غربت سے نجات ہمارا مقدر بن جائے گا"۔

"بہت خوب" ڈوہونگ خوشی سے چلایا۔ "میری بہ عرصے سے خواہش تھی کہ ہم بھی دوسروں

کی طرح ایک کوآپریٹو بنائیں"۔

وانگ نے تمام پارٹی ممبروں کو کوآپریٹو کرکے سیکرٹری کاؤ کا مشورہ سنایا۔ اور پھر سب مل کر باقی گاؤں والوں کو کوآپریٹو بنانے کے لئے منانے نکلے یہ کام آسان نہ تھا۔ چونکہ کوآپریٹو ایک نئی چیز تھے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ اور اس کے کیا کیا فوائد ہیں۔ اس لئے زیادہ تر کسان مشکوک تھے۔

کچھ نے کہا "اگر اتنے سارے آدمی ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو پھر جھگڑے اور لڑائیوں کا ہونا ضروری ہے، جس سے خاندان کے افراد میں بھی پھوٹ پڑ سکتی ہے"۔

کسی نے کہا کہ "کئی درجن گھرانے ایک ساتھ کھیتی باڑی کریں۔ ناممکن، وہ کبھی بھی ایک ساتھ متفق نہ ہوں گے، سارا معاملہ خراب ہو جائے گا" ایک بولا "بہت سارے باورچی سالن کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور بہت سارے بیٹوں کا مطلب ہے کہ کوئی بھی سہارا نہ دے گا۔ اس لئے ہم بغیر کوآپریٹو کے ہی بھلے"۔

لیکن پارٹی ممبروں نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ برابر بحث کرتے رہے اور آخر کار تئیس گھرانوں نے پارٹی کی تجویز کردہ امداد باہمی میں شرکت منظور کر لی۔

"خوب" وانگ نے کہا "ہم تئیس گھرانوں سے کام شروع کریں گے۔ اگر ہمیں کامیابی ہوئی تو جلد ہی باقی بھی شامل ہونے کی خواہش کریں گے"۔

لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے ایک جلسہ ہوا جن تئیس گھرانوں نے شرکت کی تھی انہیں فوراً ہی یہ احساس ہو گیا کہ وہ سب غریب کسان ہیں گاؤں کے غریب ترین کسان، یہ صحیح معنوں میں کنگالوں کا کوآپریٹو تھا۔ سب نے اپنے اثاثوں کو جمع کیا تو کل زمین چالیس ایکڑ تھی۔ ہل چلانے کے لئے کوئی جانور نہیں تھا۔ ایک گدھا تھا۔ جس کی تین ٹانگیں تھی۔ یعنی یہ گدھا پانچ گھرانوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ ان میں چار نے کوآپریٹو میں شرکت کر لی تھی۔ لیکن پانچویں نے نہیں۔ چنانچہ گدھے کی ایک ٹانگ کوآپریٹو میں شامل نہیں تھی۔ یہاں عام طور پر سردیوں میں کھاد دی جاتی ہے لیکن ایک گدھے کی تین ٹانگوں کے ساتھ انہیں چالیس ایکڑ زمین میں کھاد ڈالتے ڈالتے تو گرمیاں بھی گذر جائیں گی۔ کیا کرنا چاہئیے۔ وہ کوئی پیسہ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ نئے سال تک کس طرح گذارہ کریں گے۔

"چند مالدار زمینداروں کو پھانسو۔ ان کے پاس بیل اور گاڑیاں ہیں جو ہمارے کام آئیں گی"۔ ایک نے مشورہ دیا۔ "اس سے کام نہیں چلے گا" ڈوہونگ بولا۔ "ہم دھتکارے جائیں گے۔ کسی نے گیوژرونی کو شامل ہونے کی دعوت دی تھی وہ پیٹھ پیچھے ہمارا مذاق اڑاتا ہے، کہ ہم کنگال مینڈک ہیں، جو بگلے کے گوشت پر گذارہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بغیر سرمائے کے ایک کوآپریٹو شروع کر رہے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ شامل ہو جاؤ، کیونکہ میرے پاس ہل کے جانور ہیں۔ ان کو خواب نظر آ رہے ہوں گے۔ اگر یہ کنگال ایک کوآپریٹو چلا سکتے ہیں تو پھر ایک مکھی آسمان میں پہنچ کر اژدھا بن سکتی ہے"۔

ڈوہونگ نے گیوژرونی کی نقل اتارتے ہوئے کہا "کیا یہ تم سب کو غصہ سے پاگل بنانے کے لئے کافی نہیں؟ ہم کنگال کسانوں کو اپنی کمر کسنی ہوگی اور اپنی ہمت سے اس کوآپریٹو کو کامیاب بنانا ہوگا"۔

بوڑھے لائی ینگ نے کہا کہ "ڈوہونگ ٹھیک کہتا ہے لیکن اگر ہم بیل گاڑیاں اور کھاد نہیں خرید سکتے تو پھر کھیتی باڑی کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ہم کیوں نہ حکومت سے قرضے کی درخواست کریں۔ اب جبکہ ہم کوآپریٹو شروع کر رہے ہیں۔ انہیں ہماری زیادہ مدد کرنی چاہیئے"۔

بہت سے لوگوں نے منظوری میں سر ہلائے لیکن وانگ کھڑا ہو گیا۔ "میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کرتا"۔ "کیوں"؟ "ہمارا کوآپریٹو ابتدائی مراحل میں ہے"۔ وانگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہم کس طرح حکومت سے زیادہ امداد کی درخواست کر سکتے ہیں، جب کہ ہمارے پاس اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے بھی کچھ نہیں"۔

"لیکن ہمارے کوآپریٹو کو مسائل درپیش ہیں"۔ لائی ینگ نے بحث کی "شاید لیکن حکومت کو بھی تو مسائل کا سامنا ہے۔ ہمارے رضاکار کوریا میں لڑ رہے ہیں اور ان کو پورے ملک کے سہارے کی ضرورت ہے۔ ہم حکومت کا بوجھ نہیں بڑھا سکتے۔ اس کے علاوہ ہمیں قرضہ بھی واپس کرنا ہے۔ اور یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے کہ ہم پیداوار سے پہلے ہی اپنے آپ پر قرضوں کا بوجھ لاد لیں"۔

"یہ سب ٹھیک ہے" لائی نے جواب دیا "لیکن غور تو کرو کہ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں، ہم پتھر سے تو تیل نکالنے سے رہے"۔ "ہم سے ہر ایک کے پاس دو ہاتھ ہیں۔ اور اگر ہم ارادہ کر لیں تو صورت حال کو بدل سکتے ہیں"۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس ہاتھ ہیں لیکن بیل اور گاڑی خریدنے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔؟"

وانگ نے کھڑکی کے باہر اشارہ کیا "وہاں سے ہم جانور گاڑیاں اور سب کچھ حاصل کریں گے"۔

سب کی نظریں دس میل دور پہاڑوں کی طرف اٹھیں۔ انہیں لاکھ کوششیں کے باوجود سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرح جانور اور گاڑیاں فراہم کریں گے۔

"یہ پہاڑیاں جھاڑیوں اور درختوں سے بھری پڑی ہیں" وانگ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کاٹو اور بیچو۔ اس طرح ہم ضرورت کا سارا سامان خرید سکیں گے"۔

ڈوہونگ اچھل کر کھڑا ہو گیا "میں اپنے سب سے مضبوط و طاقتور آدمیوں کو کل ہی وہاں لے جاؤں گا۔ اور وانگ تم یہاں رہ کر بہار کی فصل کے لئے جتائی تیار کرو"۔

"نہیں تم یہاں ٹھہرنا اور میں پہاڑوں پر جاؤں گا"۔ وانگ نے جواب دیا "نہیں۔ نہیں۔ تم ایک سپہ سالار ہو اور میں ایک ہراول دستہ کا سپاہی۔ تمہارے کاندھوں پر ایک سوچنے والا دماغ ہے اور ہمارا کوآپریٹو ابھی شروع ہوا ہے۔ اگر زمیندار اور مالدار کسان ہمیں بدنام کریں یا ہمارے لئے مشکلات پیدا کریں تو تم یہاں مجھ سے بہتر طریقے پر ان سے نمٹ سکتے ہو۔ اور میں پہاڑوں میں بہتر کارکردگی رکھ سکوں گا"

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اگلی صبح ڈوہونگ اٹھارہ مضبوط آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور پھر پہاڑوں سے بیل گاڑیاں اور اوزار لے کر آئیں گے

باقی باتوں کا فیصلہ ہوتے ہوئے دوپہر ہوگئی

وانگ کو گھر پہنچتے پہنچتے بہت بھوک لگ گئی۔ گھر پر اس نے اپنی بیوی کو روئی کی بنڈی کی پیوند کاری میں مشغول پایا۔ وہ چولہے پر گیا۔ ہنڈیا خالی رکھی تھی

"کیا تم نے ابھی تک کھانا نہیں پکایا"۔ وانگ نے بیوی سے پوچھا "گھر میں نہ آٹا ہے نہ چاول" وہ بولی "پکانے کے لئے کچھ بھی نہیں" "پرواہ نہیں"۔

اس نے کہا "جو ہیں کسی سے اُدھار کھانے کے لئے مانگ لاتا ہوں"۔ اس نے تھیلا اٹھایا اور باہر چل دیا ایک رشتہ دار سے اُدھار اناج لے کر گھر کی طرف چلا۔ وہ صحیح معنوں میں بھوکا تھا۔ اس کا چہرہ شمال کی سرد ہواؤں سے نیلا ہو چلا تھا۔ لیکن اس کے حوصلے بلند تھے اور وہ پہاڑوں میں جانے والے انیس آدمیوں کے کام کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کسی نے اسے پکارا یہ لائی ینگ کا بڑا لڑکا لائی ہی تھا۔

"کیا بات ہے" وانگ نے پوچھا۔

"ابا نے مجھے یہ کہنے کے لئے بھیجا کہ وہ کل پہاڑوں پر نہیں جا سکے گا"

"کیوں"؟

"ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں اور وہ ہمیں اس طرح چھوڑنا نہیں چاہتا"۔ یہ ایک حقیقی مسئلہ تھا۔ جب وانگ کی نظریں اپنے تھیلے پر پڑیں تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیلا لڑکے کو پکڑاتے ہوئے اس نے کہا کہ "یہ تھیلا اپنے گھر لے جاؤ۔ اب تمہارا باپ سکونِ قلب کے ساتھ جا سکتا ہے"۔

لڑکا اناج لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب وانگ نے اصرار کیا کہ اس کے گھر میں کافی موجود ہے۔ اور یہ اس نے دوسروں کے لئے اُدھار مانگا تھا۔ تو لڑکے نے تھیلا کندھے پر لادا اور خوشی خوشی گھر کی طرف بھاگ گیا۔

اس دوران وانگ یہ سوچتا رہا کہ موسم سرد ہے اور میدان برف سے جما ہوا ہے۔ ایسے میں لکڑی کاٹنے والوں کی غذا و لباس کا انتظام ٹھیک ہونا چاہئے۔ لائی ینگ اس مشکل میں تنہا گرفتار نہیں ہوگا تئیس گھرانوں میں سے ہر ایک غریب تھا شاید بعضوں کے پاس اناج گرم کپڑوں اور جوتوں کی کمی ہوگی۔ سب کے گھر جا کر ان کے مسائل کا پتہ کر کے ان کا کوئی حل تلاش کرنا چاہئے وہ اپنی سردی و بھوک کو بھول کر گھر جانے کی بجائے ڈو ہونگ سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔

"کیا بات ہے" ڈو ہونگ نے پوچھا

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے کوآپریٹو ارکان کے پہاڑوں میں جانے سے ان کے خاندانوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے"۔

"آخر کیوں؟ ان سب نے جانے کا فیصلہ کیا تھا"۔ وانگ نے اسے لائی ینگ کے ہاں اناج کے ختم ہو جانے کے متعلق بتایا "پہاڑوں پر جانے کی یہ ہمارے کوآپریٹو کی پہلی مہم ہے" اس نے کہا "یہ ضروری ہے کہ ہم اسے کامیاب بنائیں۔ تمہیں اور مجھے اپنے کام کو پوری قابلیت سے کرنا چاہئے"

"درست ہے! تم بالکل ٹھیک کہتے ہو"۔ وانگ "تم ہر چیز کے متعلق پہلے سے سوچ لیتے ہو"۔

ان دونوں نے کوآپریٹو کے تمام ارکان کے گھروں کا دورہ کیا پتہ چلا کہ ہر گھرانے کا اپنا کچھ نہ کچھ مسئلہ ہے۔ لیکن جب بھی ان سے پوچھا گیا۔ تو غریب کسانوں نے اپنی کمر سیدھی کی اور بولے "ہم ان معمولی مشکلات سے تمہیں تکلیف دیئے بغیر ہی نمٹ لیں گے"۔

کچھ نے اپنے ضرورت مند ساتھیوں کو اناج اور پرانے جوتوں کی پیش کش کی۔ چنانچہ تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا۔ کوآپریٹو کے تمام ارکان اپنے لیڈروں کے جذبہ سے بہت متاثر ہوئے۔ "فکر نہ کرو" انہوں نے کہا "ہم لکڑیاں جمع کرنے میں اتنی محنت کریں گے کہ ہمارے کوآپریٹو کو چلانے کے لئے تمام ضروری جانور گاڑیاں اور کھاد خریدی جا سکے گی"۔

ڈو ہونگ نے وانگ کی کمر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "اس جذبے سے تو ہم پہاڑوں کو ہٹا سکتے ہیں"۔

جذبات سے مغلوب وانگ نے جواب دیا "جتنا مشکل وقت ہوگا اتنا ہی ہم کو دوسروں کی دیکھ بھال کرنی چاہئے۔ اگر ارکان خود ہم سے قریب محسوس کریں گے تو کام میں آسانی ہوگی"۔

آخری گھرانے سے ملتے جلتے رات ہو گئی۔ وانگ اور ڈو ہونگ جدا ہو گئے۔ لیکن اب وانگ کے پیٹ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اسے اپنا مانگا ہوا اناج یاد آ گیا۔ بیوی کو گھر کی دہلیز پر بیٹھے دیکھا۔ بیوی نے وانگ کو خالی ہاتھ آتے دیکھ پوچھا کہ "اناج کہاں ہے؟"

وانگ نے بیوی کو صورت حال سے آگاہ کیا بیوی خاموش ہو گئی۔ آنسو اس کے گالوں سے بہتے رہے۔

دونوں نے صحن میں سکھانے کے لئے پڑی ہوئی سبزی سے کچھ لیا زمین اور اپنے لباس سے ایک ایک پتی چنی۔ سبزی کی ڈھیری پر اپنی یہ آخری قیمتی رسد ڈالتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کو ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بتلایا کہ یہ چھلیوں کی چند مٹھیاں ہمارا سارا اثاثہ ہیں"

وانگ اسے دلاسہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے؟ یہ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن یہ پکا یقین تھا کہ اگر ۲۳ گھرانے متحد رہے تو وہ راہ کی مشکل ترین رکاوٹوں کو ہٹا سکتے ہیں۔ اگلے دن وہ عورتوں کو کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے لے گیا۔ دوسری طرف ڈو ہونگ اور اس کے اٹھارہ ساتھی چینی سے پہاڑوں کی طرف مارچ کر رہے تھے۔

کیا مشکلات نے انہیں دبا پایا ہوا تھا نہیں! انہوں نے سب کا حل نکالا۔ ذرا ان آدمیوں کو دیکھو یہ رئیس کنگال ہیں لیکن ان کا دل و دماغ ایک ہے انہوں نے گھاس سے رسیاں بنیں اور پرانی درانتیوں کو تیز کیا۔ خشک راشن اور بستر کمر پر لادے گاؤں چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف چلے ناقابل عبور چٹانیں اور بلند و بالا چوٹیاں بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں دن بھر وہ لکڑیاں کاٹتے اور رات کو ایک بوسیدہ مندر میں سو جاتے۔ سرد خنجر کی طرح ہوائیں۔ اور روئی کے گالوں کی طرح برف بھی ان کے عزم کو نہ ہلا سکی یہ غریب انسان جن کی ہمت و جرأت آسمان سے بلند ہے۔ مشکلات کے باوجود انہوں نے پہاڑوں سے خزانے چھین لئے اور سخت محنت کے بعد وہ گھر واپس آئے۔

بیس دن میں انہوں نے بیس ٹن سے زیادہ درخت کاٹے جو ۴۳۰ یوان کے عوض شہر میں بک گئے۔ ان کنگال افراد نے اپنی زندگی میں اتنی رقم کبھی دیکھی نہ تھی۔ اس رقم کو خرچ کرنے کے لئے ارکان کوآپریٹو کی ایک میٹنگ بلائی گئی۔

لائی ینگ نے وانگ سے کہا "چینی سال نو جلد ہی آنے والا ہے اور ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ گذشتہ برسوں میں ہم امیروں سے قرضہ لیتے تھے۔ اس سال انہوں نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کہنا ہے کہ "تم تمہارے کوآپریٹو کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ اب تم کنگال امیر ہو گئے ہو۔ تمہیں قرضے کی ضرورت نہیں ہے"۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس ۴۳۰ یوان میں کچھ بانٹ لیں تاکہ سال نو کے موقع پر ایک گھرانے میں کھانے کے لئے پڈنگ ہو جائے"

یہ مشورہ اکثر نے پسند کیا۔

"یہ بُرا ہوا" وانگ نے سوچا۔ انہوں نے پہاڑوں میں اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے اور اب یہ درست بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کو سال نو کے جشن میں حصہ لینے دیا جائے۔ لیکن اگر اس رقم کا بٹوارا کیا جائے تو ہم سب کو نقصان ہوگا۔ لہٰذا اس نے کہا "یہ قدرتی بات ہے کہ سال نو کا جشن منایا جائے۔ لیکن اگر اس رقم کو بانٹ لیں تو پھر نہ تو ہم بیل اور گاڑیاں خرید سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اچھی فصل اگا سکتے ہیں۔ اگلے سال ہم پھر اسی صورت میں ہوں گے۔ اتنے دنوں کی محنت کو یوں ایک گھنٹے میں جلا کر راکھ نہ کرو۔ ہمیں مستقبل کی سوچنی چاہیئے۔ اگر ہم اگلے سال اچھی فصل کے لئے آج قربانی دیں اور کوآپریٹو کو کامیاب بنائیں تو اگلا سال تو یقینی طور پر خوش کن ہوگا۔ آؤ ہم اس رقم کا بہترین مصرف تلاش کریں۔"

یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ انہیں اپنی چادر دیکھ کر حساب سے پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ ایک خراب فصل آج کی پڑینگ کے لئے خاصی بڑی قیمت ہوگی لہٰذا انہوں نے رقم کا بٹوارا کرنے کے بجائے ایک بیل ایک ٹٹو، ایک گاڑی اور انیس بھیڑیں خرید لیں اور سارا کوآپریٹو اس خریداری پر بے حد خوش تھا۔

لیکن ان اثاثوں نے نئے نئے مسائل پیدا کئے ان کے پاس بھیڑوں کے لئے باڑہ نہیں تھا۔ گاڑی جوتنے کے لئے ساز و سامان نہ تھا۔ بیل کے لئے چارہ نہیں تھا۔ ممبر بھی غربت کی وجہ سے معمولی مدد ہی کر سکتے تھے ہر خاندان نے لکڑی کے دو تختے، ڈوکیلیں اور بھوسے کے "دو گٹھے" دیئے پھر انہوں نے بھیڑوں کے لئے باڑہ بنایا۔ دریا سے نکالے ہوئے پتھروں اور لکڑیوں سے بیل کا تھان تیار کیا۔ اس کے باوجود گاڑی کے جوتنے کا سامان اور چارے کا مسئلہ جوں کا توں موجود تھا وانگ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "پھر ان ہی پہاڑوں سے مدد حاصل کرو"

موسم بہار کی کھیتی کی وجہ سے سارے آدمی تو پہاڑوں پر نہ جا سکے اس لئے صرف نو آدمی ہی گئے بیس دن کی سخت محنت کے بعد وہ پہاڑوں سے جھاڑیوں کے دو سو گٹھے لائے۔ جن سے ۲۱۰ یوان کی آمدنی ہوئی۔ بیل گاڑی کے سامان کے ساتھ انہوں نے مزید ایک ٹٹو گیارہ بھیڑیں اور لوبیا کے دہی کا کاروبار شروع کرنے کے لئے لوبیا دلنے کی ایک چکی بھی خریدی۔ اس طرح اب کنگالوں کے کوآپریٹو کے پاس سب ملا کر ایک بیل، دو ٹٹو، تیس بھیڑیں ایک گاڑی اور گدھے کی تین ٹانگیں تھیں اب اس کے ارکان جوش و جذبے سے پُر تھے۔

کنگال محنت کے لئے رضامند تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسائل سے گھرے ہوئے تھے فصل پکنے سے پہلے ہی ان کے اناج کا ذخیرہ ختم ہوگیا بعض کے پاس ہانڈی میں ڈالنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ کھیت میں ڈائی منگ بھوک سے بے ہوش ہوگیا تو وانگ نے اسے باقی ماندہ لوبیے کا شوربہ بنا کر دے دیا۔ لیکن اسے اور اس کی بیوی کو اب جنگلی پودوں پر گذارہ کرنا پڑ رہا تھا۔

بھوک نے کوآپریٹو ممبروں کے کام اور جذبے پر اثر ڈالا۔ لائی ینگ نے کھیتوں میں بڑبڑانا شروع کر دیا "اگر میں کوآپریٹو میں شامل نہ ہوتا تو اپنے بیٹے کو کہیں کھیت مزدور ہی رکھوا دیتا۔ اس طرح میرے گھر ایک پیٹ کم ہوتا۔ اور سال کے آخر میں کچھ پیسے بھی ہاتھ آتے اب تو گھر میں چاول کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔"

لائی ینگ کے کھیت کی نشاندہی کرنے والے پتھر ہل کے راستے میں آتے تھے اور کوآپریٹو کے ممبروں نے انہیں ہٹانا شروع کر دیا لیکن لائی ینگ غصے سے بولا "انہیں ہٹانے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو جون کی فصل کے بعد میں کوآپریٹو چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے انہیں دوبارہ رکھنا پڑے گا۔"

کسی نے وانگ سے اصرار کیا۔ "کچھ ادھ پکی فصل ہی کو کاٹ لینے دو بھوک سے تو بچیں گے۔"

"اور اپنی فصل تباہ کریں" وانگ نے کہا "ہمیں اب کوئی اور راہ نکالنی ہوگی۔ آج صبر کرو کل اس کا پھل میٹھا ملے گا۔"

پارٹی کے ممبران نے آپس میں مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ وہ کیکر ببول کاٹیں گے کانٹوں اور پتوں کو کھاد کے لئے رکھ کر تنوں کو بیچ کر اناج خریدیں گے

گھوروٹی کوآپریٹو کو ناکام کرنے کے لئے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا۔ "یہ کنگال اب مایوس ہو چکے ہیں۔" وہ ان کے پیٹھ پیچھے شور مچاتا۔ "ان کے کیکر ببول کوئی بھی نہ خریدے گا ان کے بھوکے پیٹ شور مچا رہے ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے یہ اپنا کوآپریٹو توڑ دیں اتنا ہی ان کے لئے بہتر ہوگا۔"

ڈو ہونگ نے سنا تو وہ غصہ سے اچھل پڑا۔

"غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے ہاتھ نہیں بِکیں گے۔" اس نے ممبروں سے کیکر ببول کی ٹہنیوں سے ڈلیا اور ٹوکریاں بنوائیں اور دوسرے گاؤں میں فروخت کر کے کچھ رقم جمع کی۔ مگر وہ اتنی نہ تھی کہ خریدا ہوا غلہ سب گھروں میں بٹ سکے وانگ نے اپنا حصہ دوسروں کو دے دیا۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا۔ تو انہوں نے احتجاج کیا لیکن وہ بولا "فکر نہ کرو ہمارے ہاں ابھی کچھ بچا ہوا ہے"۔

وہ ہر روز دبلا اور اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ کچھ پڑوسیوں نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ اس کا خاندان گھاس پھوس پر گذارہ کر رہا ہے۔

پارٹی نے شروع ہی سے اس کوآپریٹو میں دلچسپی لی تھی۔ جب ضلعی پارٹی کے سیکرٹری کو اس کے مسئلوں کا علم ہوا تو ایک قرضہ کی پیش کش لے کر چھانگ یو گاؤں آیا۔

"ہماری فکر نہ کرو۔ ہم ٹھیک ٹھاک ہیں" وانگ نے کہا۔ "میں ضمانت دیتا ہوں کہ کوئی بھوک سے نہیں مرے گا۔"

"تم تو خود بھوت کی طرح پیلے پڑ گئے ہوئے" وانگ کاؤ نے جواب دیا۔ وانگ نے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے ہنس کر کہا "یہ میرا قدرتی رنگ ہے میں بھوکا نہیں ہوں"۔

"بھوکا نہیں؟ تم نے کئی دنوں سے چاول کا ایک دانا نہیں کھایا" کاؤ نے دریافت کیا۔ "اگر ہمارا کوآپریٹو اتنا طاقتور ہو جائے کہ ہمارے کسی بھی ممبر کو دوبارہ کبھی بھوکا نہ رہنا پڑے تو مجھے چند وقت کا فاقہ منظور ہے۔ اس کے علاوہ حکومت اور پارٹی کو اور بڑے مسئلوں سے نبٹنا ہے۔ ہم ان کے بوجھ میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔"

اس قسم کے پارٹی ممبروں کے ساتھ جو ہمیشہ دوسروں کا بھلا سوچتے ہیں اور اس قدر دلجمعی کے ساتھ سب کے لئے کام کریں تو کوآپریٹو ضرور چل پڑے گا۔ کامریڈ کاؤ نے سوچ کر کہا "اگر لوگوں کے سامنے مسائل ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کو حل کرے۔ ان پچاس یوان سے کچھ اناج خریدو۔ اور امداد باہمی جڑیں پکڑے گی اور یہ بہت خوب ہوگا۔"

انہوں نے قرضے کے ساتھ کوآپریٹو کے لئے اناج خریدا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر ایک پارٹی ممبر

'چیئرمین! کھیت کی نشاندہی کرنے والے ان پتھروں کو ہٹا دینا چاہیئے'

نے اناج میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ ماں سے زیادہ کسی کا پیار نہیں لیکن پارٹی ہماری پرواہ ماں سے بھی زیادہ کرتی ہے۔ بالکل صحیح وقت پارٹی نے ہمیں یہ قرضہ دیا تاکہ تکلیف سے نجات حاصل ہو۔"

اس امداد سے سب میں زیادہ محنت کا جذبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے کھیتوں میں خوب کھاد ڈالی۔ انہیں گھاس پھونس سے پاک وصاف رکھا تاکہ فصل خوب اچھی اُگے۔ جب اکیلے کام کرنے والے کسانوں نے یہ دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ باہمی امداد کس قدر بہتر ہے بہت سوں نے اپنے دل میں فصل کے بعد کوآپریٹو میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

پریشانی صرف ایک شخص کو تھی اور وہ تھا گیوتروئی۔ "اس سے پہلے کہ آپریٹو اپنے پیروں پر کھڑا ہو مجھے اسے تباہ کرنے کے لئے کوئی ترکیب ڈھونڈنی چاہیئے"۔ اس نے سوچا "میں کوآپریٹو سے مقابلہ کروں گا۔ اس سے بازی لے جاؤں گا میرے پاس ایک گدھا تین بیل۔ تیس بھیڑیں چار سور اور پانچ ایکڑ اچھی زمین ہے۔ اتنے سارے جانوروں اور سرمائے کے ساتھ میں ضرور ان کنگالوں کو سبق سکھاؤں گا۔"

اس کی کچھ زمین کوآپریٹو کے کھیتوں سے ملتی تھی۔ اس نے ایک ہی فصل بونے، کوآپریٹو ممبروں کے تمام افعال کی نقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی طرح اس نے بھی ایک ایکڑ مکئی کاشت کی شروع میں دونوں فصلیں ایک ہی طرح آگئیں۔ گرمیوں میں جب کوآپریٹو ممبروں نے اپنے کھیتوں میں بھیڑوں کی مینگنیوں کی کھاد دی۔ گیوتروئی نے سور کا گوبر استعمال کیا۔ لیکن کوآپریٹو میں کام کرنے والے ہاتھ زیادہ تھے اور گیوتروئی کے خاندان میں صرف تین افراد کام کرتے تھے۔ اس کے گھر سے اس کے کھیت کا راستہ پہاڑوں اور وادیوں میں سے تھا۔ وہ اور اس کے بیٹے سارے دن کھاد لادنے اور لے جانے میں اتنے مصروف رہے کہ ان کے پاس اسے بکھیرنے کا وقت نہیں رہا۔ دوپہر کو گیوتروئی کو احساس ہوا کہ کوآپریٹو کام ختم کر چکا ہے اور اسے ابھی بہت سارا گوبر کھیت میں پہنچانا ہے اس نے دانتوں کو بھینچ کر لمبا لب لوکریاں بھرنا شروع کیں۔ اس کے بیٹوں کو گوبر ڈھوتے ڈھوتے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی پوری طاقت سے کام کیا۔ لیکن اپنے کھیت تک صرف آدھا گوبر لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ جب کہ کوآپریٹو کے ارکان کھیت میں آخری ڈھیری بکھار رہے تھے۔ گیوتروئی بغیر سانس لئے دوسری لوکری لینے کے لئے واپس ہو گیا۔ لیکن جب تک وہ گاؤں پہنچا کوآپریٹو کے ارکان اپنا کام ختم کر کے گاتے باتیں کرتے واپس گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دل میں غصہ ہوتے ہوتے اس نے ایک آخری چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کی کمر درد کر رہی تھی اور گدھا تھک چکا تھا۔ وہ گدھے کو مارتے لیکن وہ ایک انچ آگے نہ ہوتا۔ لہٰذا انہیں ہر دو قدم پر ستانا پڑا اس چکر میں رات ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے گوبر کو کھیت میں ڈھیر لگا کر بکھیرنے کا کام کل پر چھوڑ دیا اور گھر لوٹ گئے

جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو بادلوں کی گرج چمک شروع ہو گئی۔ پھر ایک گھنٹے تک موسلا دھار بارش ہو گی۔ گیوروئی کو ستا رہا۔ صبح سویرے وہ اور اس کے بیٹے کھیت پر پہنچے تو ان کے ستو دوں کا سارا گوبر بہہ کو آپریٹو کے کھیتوں میں جا چکا تھا کیونکہ وہ ڈھلان میں واقع تھے۔ اس سارے گوبر کی طفیل وہاں مکئی ہری اور مضبوط ہوئی جب کہ گیتوروئی کی پیلی اور نازک تھی۔ غصے میں اس نے دو بھیڑیں بیچ کر شہر سے کیمیائی کھاد خریدی۔

جب ڈوہونگ نے یہ دیکھا تو اس نے سوچا کہ ہم بھی کیوں نہ کچھ کھاد خریدیں۔

"تمہیں ہمیں اپنے غریبوں والے طریقے ہی اپنانا چاہیں"۔ وانگ نے کہا "ہم اپنے کھیتوں کی نلائی اچھی طرح کریں گے۔ کھاد کے مقابلے میں زمین کی گڑائی فصل کے لئے زیادہ مفید ہو گی۔

جب گیوروئی نے انہیں گڑائی کرتے دیکھا تو اسے فکر نہ ہوئی "تم کنگالوں کے پاس سوائے کام اور مزید کام کے رکھا ہی کیا ہے"۔ اس نے سوچا۔ بس ذرا دیکھتے جاؤ اس کھاد سے میری مکئی کس طرح پھوٹتی ہے۔ لیکن وہ غلطی پر تھا اس نے کھاد سے زیادہ مقدار میں ڈال دی تھی۔ جب دھوپ میں تیزی پیدا ہونا شروع ہوئی تو اس کی "مکئی کے پتے مرجھانے لگے باپ بیٹوں نے جلدی جلدی پانی دینے اور گھاس پھونس نکالنے کی کوشش کی لیکن اب وقت گذر چکا تھا۔ اس نے کھیت مزدور رکھنا چاہا تو اسے کوئی مزدور نہیں مل سکا۔ کیونکہ تمام کنگالوں نے کوآپریٹو میں شرکت کر لی تھی۔ اور کسان خود اپنے کھیتوں میں مشغولیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال سکتے تھے

کوآپریٹو کی مکئی خوب بلند و بالا اور مضبوط اُگی فصل کٹتے وقت پر بھٹا فٹ فٹ لمبا اور موسل کی طرح موٹا ہو گیا اس میں گھوڑے کے دانتوں جیسے سنہری دانے بڑی خوبصورتی سے گتھے ہوئے تھے گیوتروئی کے بھٹے مشکل قلم کے برابر لمبے موٹائی انگوٹھے جیسے اور دانے صرف چند تھے۔

اب فصل کا بٹوارہ ہوا۔ لائی ینگ کے ساتھ افراد خانہ میں سے صرف تین کام کرتے تھے۔ اس کا ڈھائی ایکڑ کا کھیت تھا۔ پچھلے سال باہمی امدادی ٹیم میں کام کر کے انہیں اناج کے صرف چھ پکل (چینی وزن کا ایک پیمانہ) ملے تھے۔ اس دفعہ انہیں اکتالیس پکل وصول ہوتے لائی ینگ خوشی سے اچھل پڑا۔ اور وانگ گگ ژنگ کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگا "چیئرمین یہ کھیت کی نشاندہی کرنے والے پتھروں کو ہٹا دینا چاہیئے ان سے کافی زمین ضائع ہوتی ہے۔ اور یہ ہل کے راستے میں بھی آتے ہیں"۔ "ہم انہیں منتقل کر کے کیوں اپنے آپ کو تھکائیں"۔ وانگ نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "دو چار دن کے بعد انہیں دوبارہ لگانے کے لئے ہمیں تمہاری مدد کرنا پڑے گی"۔

"مذاق مت کرو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اب زندگی بھر کے لئے کوآپریٹو میں ہوں۔ اگر تم مار کر بھی نکالو گے تو بھی نہیں نکلوں گا۔"

یہ ایک بڑا مشکل سال تھا۔ لیکن ابھی سے کنگالوں کے کوآپریٹو نے امداد باہمی کے فواید تبلا دیئے تھے فصل کے بعد ساٹھ خاندانوں نے شامل ہو کر تعداد ۳۸ تک پہنچا دی۔ سخت محنت اور کفایت شعار انتظام کے باعث کوآپریٹو ہر سال ترقی کرتا رہا۔

بہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں یعنی اپنے قیام کے صرف تین سال بعد ہی اس کی شکل بدل گئی۔ جو خاندان بھی کوآپریٹو میں شامل ہونے کے قابل تھا۔ وہ شامل ہو چکا تھا۔ اب انہوں نے قریب کے تین گاؤں سے مل کر ایک اعلیٰ درجے کا ایک بڑا کوآپریٹو تشکیل دیا ان کی غریب وادی مالدار ہو چکی تھی۔ بنجر پہاڑیاں لہلہانے لگیں۔ ناہموار پہاڑی پگڈنڈیاں ہموار سڑکوں اور گھاس پھونس کے جھونپڑے پکے گھروں میں تبدیل کر لئے گئے۔ اور ہر خاندان کے پاس فاضل اناج اور رقم بنک میں جمع تھی۔ اور گاؤں میں زیادہ شادیاں ہونے لگیں۔ یہ بات چھانگ یو گاؤں کے لئے بہت بڑی بات تھی۔ ہر جگہ ہونے لگیں یہ جگہ اتنی غریب تھی کہ چھانگ یو کی لڑکی مقامی لڑکے سے شادی کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ اور باہر کی لڑکیاں چھانگ یو آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اور اب نہ صرف مقامی لڑکیاں اپنے گاؤں کے لڑکوں سے شادی کر رہی تھیں بلکہ دوسرے گاؤں کی لڑکیاں بھی یہاں بخوشی دلہن بن کر آ رہی تھیں شادی اچھی چیز ہے لیکن اس کا پیداوار پر بہت بُرا اثر پڑا پہلے نوجوان اپنی مقدور بھر محنت کرتے تھے۔ صبح کے سائرن سے پہلے ہی خوشی خوشی جمع ہو جاتے اور جیسے ہی ٹیم کا لیڈر ان کو کوئی کام بتلاتا وہ چیتے کی پھرتی سے کھیتوں کی طرف لپکتے لیکن اب وہ کام پر دیر سے جاتے بعض دفعہ سائرن بج کر خاموش ہو جاتا۔ جب نئے شادی شدہ نوجوان باہر نکلتے کھیتوں میں، کام کرتے وقت ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھروں کو لوٹنے کی سوچتے۔ چند گھنٹوں کی جدائی ان کے لئے اتنی طویل تھی کہ وہ گھر بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جاتے اس طرح جو کام پہلے ایک دن میں ہوتا تھا۔ اب دو دن میں ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ کارکردگی میں کمی آتی گئی۔ بعض دفعہ تو کوئی نوجوان سرے سے کام سے غائب ہو جاتے۔ اگر لیڈر دریافت کرتا تو جواب ملتا "میرے نمبر کاٹ لینا۔ میرے گھر بہت اناج ہے اور بنک میں پیسہ بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہے"

وانگ نے یہ مسئلہ پارٹی ممبروں کے سامنے رکھا۔ "ہمارے والدین کے زمانے میں نئے شادی شدہ افراد جب ایک دوسرے سے کسی گلی میں مل‌تے تو ایک دوسرے کو پہچانتے ہوئے شرماتے تھے۔" ڈوہونگ بولا۔ "لیکن آج کل یہ نوجوان جوڑے تو گوند کی طرح ایک دوسرے سے چپکے ہوئے رہتے ہیں۔ ہمیں سستی سے کام کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیئے"۔

"اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا" وانگ نے جواب دیا۔ "آج ہم سب نوجوانوں کو ایک جلسہ میں بلاتے ہیں اور بات چیت کرتے ہیں"۔

کھانے کے بعد جو بیس نئے شادی شدہ جوڑے اور گاؤں کے غیر شادی شدہ لڑکیاں لڑکے جمع ہو گئے تو وانگ نے ان سے پوچھا "آج کل زندگی کیسی گذر رہی ہے"۔

ایک لڑکا بولا۔ "زندگی تو آجکل آسان ہے"

"اور ہم کس طرح اس طریق زندگی تک پہنچے" وانگ نے پوچھا۔ "سخت محنت سے" جواب ملا۔

اس نکتہ پر ڈوہونگ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "سخت محنت" وہ چلایا۔ "مجھے پھر یہ تبلاؤ تمہارے دادا اور باپ نے محنت کر کے اپنا ستیاناس مار لیا ایک بھوک سے جان دے بیٹھا اور دوسرے نے خودکشی کر لی۔ اور تمہارا خاندان ان کے کفن بھی نہیں بنا سکا۔ بس ان کے گرد کوئی چیز لپیٹ دی۔ کیوں؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں"

نوجوان خاموش ہو گئے۔ آخر ایک نوجوان

کنگال کسانوں نے خود پر بھروسے، سخت محنت اور استقلال سے اپنی قسمت بدل ڈالی

نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہماری آج کل کی سہل زندگی پارٹی کی صحیح لیڈر شپ کی وجہ سے ہے"۔

"درست ہے"۔ وانگ نے کہا۔ "پارٹی نے ہمیں بچا لیا۔ ہمیں کوآپریٹو بنانے کے لئے منظم کیا تاکہ ہماری بنجر پہاڑی وادی سے اچھی فصلیں اگائی جاسکیں تاکہ ہم کنگال اب انسانوں کی طرح رہ سکیں تمہارا کیا خیال ہے کہ اب تم پارٹی کو مایوس نہیں کر رہے ہو ایک نوجوان میاں بیوی میں پیار ہونا چاہیئے لیکن یہ پیار کام میں مانع نہیں ہونا چاہیئے۔ آج کا کل سے مقابلہ کرو۔ زندگی بہتر بنانے کے لئے آج سے کہیں زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بہترین تو ابھی شروع ہی ہونے ہیں۔ اس لئے سستی اور کام چوری کا تو کوئی وقت ہی نہیں ہے"۔

نوجوانوں کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اور جذبات سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔ اگلے دن جیسے ہی سائرن بجا وہ سب کے سب پھر سے چیتے کی سی تیزی و پھرتی سے کھیتوں کی طرف لپکے

سال بہ سال چھانگ یو کی حالت بہتر ہوتی گئی دس سال میں کئی کوآپریٹو اس عوامی کمیون میں ضم ہو گئے۔ جس کا چیئرمین وانگ گگ ژنگ تھا ۱۹۵۲ء میں انہوں نے گدھے کی تین ٹانگوں سے کوآپریٹو شروع کیا اب زراعت مشینی اوزاروں سے کی جاتی اب ان کے پاس کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے ٹریکٹر برقی پمپ چاول کو صاف کرنے والی موٹریں غلہ کی نقل و حرکت کے لئے ٹرک ہیں۔

دس سال پہلے پتھریلی پہاڑیوں میں مٹی سے زیادہ ریت تھی جس سے سیلاب اور خشک سالی دونوں سے فصل خراب ہو جاتی تھی۔ انہوں نے پانی کے لئے نہریں کھودیں۔ ریتلی پہاڑیوں کو سیراب زندہ کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ خشک سالی کے زمانے میں وہ فصلوں کو پانی دے سکتے ہیں۔ ایک ایکڑ میں چھ سو ہنڈر ویٹ کی جگہ اب وہ ڈیڑھ ٹن کے لگ بھگ اناج اگاتے تھے بنجر پہاڑیوں میں ہر جگہ پھلدار درخت لگے ہوئے تھے۔ اب چھانگ یو کے گاؤں میں ہرے بھرے پہاڑ ٹھنڈا میٹھا پانی زرخیز زمین اور مالدار لوگ بستے ہیں۔

دس سالوں میں بہت سے لوگوں نے پکے مکان بنائے۔ لائی ینگ کے بھائی پہلے ایک گھاس پھونس کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہتا تھا۔ جس سے ہوا اور بارش اندر آتی تھی۔ اب اس نے گھر نیائٹ کی بنیادوں پر پانچ کمروں کا مکان بنا لیا ہے۔ ہر کمرے میں برقی قمقمے ہیں۔ اگر کسی اونچی پہاڑی سے وادی میں دیکھا جائے تو رات میں برقی قمقمے موتیوں کی طرح جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں۔

چھانگ یو کے گاؤں کے کنگال کسانوں نے خود پر بھروسہ، سخت محنت اور استقلال سے اپنی قسمت بدل ڈالی۔

اسٹار نیوز ایجنسی

برطانوی حکومت کو خفیہ رپورٹ بھیجتی تھی

افضل صدیقی

"اسٹار نیوز ایجنسی" جہاں میں دن کو فل ٹائم کام کرتا تھا، برطانوی ایجنسی تھی۔ اس کا تعلق برطانوی حکومت سے اگرچہ براہ راست نہ تھا۔ لیکن پاکستان میں اس کا کام پُراسرار طور پر برطانوی مفادات کو آگے بڑھانا تھا۔ برطانوی ہائی کمیشن سے اس کا رابطہ رہتا تھا۔ اور ہائی کمیشن ہی سے اس کو گرانٹ ملتی تھی۔ ورنہ اس ایجنسی کی اتنی آمدنی نہیں تھی کراچی لاہور اور ڈھاکہ کے دفتروں کے معقول اخراجات پُورے ہو سکتے۔ ایجنسی کے سربراہ ایس جے ڈبلیو کولز کی اپنی تنخواہ ڈھائی ہزار روپے اور کراچی آفس کے ایڈیٹر انچارج عثمان صدیقی کی تنخواہ تیرہ سو روپے ماہوار تھی۔ ہر آفس میں معقول عملہ کام کرتا تھا۔ اور دفاتر تینوں شہروں میں مرکزی جگہوں پر واقع تھے اور ان کے کرائے بھی بہت تھے۔ وائرلیس، ریڈیو مانیٹرنگ کا انتظام بھی بہت مہنگا تھا۔ تینوں دفاتر میں ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے کولز اور عثمان صدیقی دونوں آئے دن دورے کرتے رہتے تھے۔ دونوں بوٹ کلب اور کراچی جمخانہ کے ممبر تھے۔ کئی پاکستانی ایسوسی ایشنوں میں ان کا عمل دخل بھی تھا۔ شہر کی شاید ہی کوئی بڑی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب ایسی ہو جس میں یہ شریک نہ ہوتے تھے۔ لاہور آفس کے انچارج پہلے اے جی ایس جعفری ہوتے تھے۔ ان کے بعد خالد لطیف اس حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ڈھاکہ آفس کے انچارج خواجہ شہاب الدین کے داماد موسیٰ احمد تھے۔ چھوٹے عملے اور سب ایڈیٹروں اور ریڈیو مانیٹر کرنے والوں کا تقرر انہی کی سفارش پر ہوتا تھا۔ کولز صاحب ان کی سفارش اور پسند پر تقرریوں کی منظوری دینے کے پابند تھے۔ لوکل ٹیلنٹس سے وہ واقفیت نہیں رکھتے تھے "آٹا جاٹا" قسم کی اردو بھی جانتے تھے۔ لیکن ان کا میل جول سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقہ اور سفارتی حلقوں کے افراد سے ہی رہتا تھا۔ دفتر میں بہت تھوڑا وقت گذارتے تھے۔ ان کی دوسری سرگرمیاں بہت تھیں۔ جن سے ماتحت عملہ ناواقف رہتا تھا۔ مسز کولز کی بیگم بھی اکثر شام کو دفتر آجاتی تھیں۔ تھوڑا بہت کام نمٹا دیا کرتی تھیں۔ ان کا بیشتر وقت برطانوی ہائی کمیشن اور دوسرے سرکاری دفاتر میں بسر ہوتا تھا۔ عمر ڈھل چکی تھی لیکن اپنی صحت کو انہوں نے بڑا سنبھال کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے اُٹھنے بیٹھنے، چال، ڈھال اور بات چیت میں ایک تمکنت آمیز وقار اور حسن جھلکتا تھا۔ اسکرٹ انہوں نے ہمیشہ گھٹنوں سے نیچا ہی پہنا۔ دونوں میاں بیوی اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور انگریزوں کے بڑے ستھرے اور کلچرڈ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اسٹار نیوز ایجنسی غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر میں یہاں قائم ہوئی تھی اور ۱۹۶۷ء میں بند ہو گئی۔ گویا سترہ سال تک اس ایجنسی کے تینوں دفاتر نے خوب کام کیا۔ مسٹر کولز یہ ایجنسی قائم کرنے سے پہلے اپنے ملک کے ہائی کمیشن میں کام کرتے تھے۔ کرکٹ کے رسیا تھے اور ریڈیو سے خاص خاص موقعوں پر کرکٹ کمنٹری بھی کیا کرتے تھے۔ اس وقت عمر قریشی کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ کرکٹ میچوں کی کمنٹری نشر کرنے کے کولز ہی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ دونوں میاں بیوی ویک اینڈ منانے ہاکس بے ضرور جاتے تھے۔ جہاں ان کا اپنا ایک جھونپڑا تھا۔ ان کی ایک بیٹی اور بیٹا تھا۔ بیٹا دس سال کا تھا۔ مگر بیٹی جوانی کی سرحد میں داخل ہونے والی تھی۔ اب تک تو نہ جانے کتنے معاشقے وہ بھگتا چکی ہو گی۔ دونوں ماں بیٹیوں کا رکھ رکھاؤ کچھ اس ڈھب کا تھا کہ انہیں دیکھ کر احترام کے سوا کوئی جذبہ ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بیٹی تو نیم پرستش کے قابل تھی۔ بقول حسرت موہانی ؎

دیکھنا بھی انہیں تو دُور سے دیکھا کرنا

کچھ یہی کیفیت اُسے دیکھ کر طاری ہوتی تھی۔ بیٹا بہت بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کی بیوقوفیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بڑا ہو کر بڑا شاطر انگریز نکلے گا۔ ہر انگریز پہلے پہلے اپنے آپ کو بیوقوف اور سیدھا ہی ظاہر کرتا ہے۔ اور پھر ایک دم ایسٹ انڈیا کمپنی بن جایا کرتا ہے۔ ایک غریب بدو کے خیمے میں اونٹ جس ترکیب سے داخل ہوا تھا کچھ ایسے ہی ہتھکنڈے انگریز کے ہوا کرتے ہیں۔

مسٹر کولز اور مسز کولز بظاہر بڑے سیدھے اور بڑے شریف نظر آتے تھے۔ مگر تھے بڑے گھنے۔ وہ شہر کی سماجی زندگی میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ کسی اہم تقریب میں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے گمان ہوتا تھا کہ برطانوی ہائی کمیشن اُن سے کچھ اور ہی کام لے رہا ہے۔ نیوز ایجنسی تو محض دھوکے کی ٹٹی تھی تاکہ جاسوسی کی سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی مفاد کی خبروں کی بھی اشاعت پاکستانی اخباروں میں ہوتی رہے۔ تقریباً سارے انگریزی اور اُردو اخبارات اسٹار نیوز ایجنسی کی خبروں کے خریدار تھے۔ رقم بھی انہیں معمولی ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس وقت اردو اخباروں میں کام کرنے والوں کے لئے تو "اسٹار" کی اردو خبریں کبھی کبھی نعمت بن جایا کرتی تھیں۔ جب اخباروں میں جگہ بھی کافی ہوتی تھی اور کاغذ کا قحط نہیں تھا۔ نہ صفحات کی پابندی تھی۔ جب کبھی خبروں کا توڑا پڑتا اور کاتب حضرات شور مچانے لگتے تو "اسٹار" کے اردو بلیٹن کی سدابہار قسم کی خبریں شعبہ کتابت میں لڑھکا دی جاتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ اسٹار کی زیادہ خبریں چھپ جائیں تو شور مچ جاتا کہ سب ایڈیٹر کام چور ہو گئے ہیں۔ اس ایجنسی کی خبروں کا ڈھب کچھ ایسا ہوتا تھا۔

ہفت روزہ الفتح کراچی

خواجہ شہاب الدّین کے داماد اسٹار نیوز ایجنسی کے ڈھاکہ آفس کے انچارج تھے

"آسٹریلیا میں بھیڑوں کی کھالوں اور اُون کی برآمد میں اضافہ ——— برطانیہ میں سونے کے محفوظات کی صورت حال بہتر ہو گئی ——— پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت ترقی کی شاہراہ پر ——— اس سال دنیا بھر میں روئی کی پیداوار میں اضافہ کا امکان کرائسلر اور فورڈ کمپنیوں میں مقابلہ ——— چار دروازوں کی کاریں زیادہ تیار ہونے لگیں ———"

ممکن ہے آپ کی نظروں میں بھی اس قسم کی خبریں گزرتی رہی ہوں۔ اب ایسی خبریں تو نہیں چھپتیں۔ لیکن علاقائی اطلاعات کے محکمے اس قبیل کی خبروں کے ہینڈ آؤٹ اب بھی جاری کرتے ہیں۔ اُنسے اسٹار کی خبروں کی کمی پوری ہو جاتی ہے جیسے

"قاضی احمد میں مکئی کی فی ایکڑ پیداوار بڑھ گئی۔ ٹنڈو اللہ یار میں کتّا مار مہم کی کامیابی وغیرہ۔"

ایسی خبریں علاقائی نامہ نگاروں کو ڈپٹی کمشنروں یا محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹروں سے اچھے تعلقات قائم رکھنے کے لئے بھی بھیجنی پڑتی ہیں اور وہ تصویریں بھی جن میں ان کی بیگمات کو مینا بازار کا فیتہ کاٹتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

ہاں تو ذکر اسٹار نیوز ایجنسی کی خبروں کا تھا۔ جنہیں تقریباً ہر اخبار خریدتا تھا۔ ان خبروں کے لئے تاریخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جب جی چاہے چھاپ دیجئے۔ یا دو مہینے پہلے چھپی ہوئی ایسی ہی خبروں کو پھر استعمال کر ڈالئے۔ ہمیشہ ہر موسم میں نئی معلوم ہوں گی۔ اخبار کا پیٹ جو بھرنا ہوا۔ انگریزی اخبار اگرچہ اسٹار کی خبریں کم استعمال کرتے تھے۔ لیکن کھیلوں، فلم اور تجارت و صنعت پر بعض فیچر چھاپ دیا کرتے تھے۔ کسی اخبار میں دو کالم کا ایسا کوئی فیچر ہفتہ میں ایک مرتبہ چھپ جاتا تھا تو بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ایجنسی نے بعض اخباروں سے کالم کے حساب سے خبروں کا معاوضہ طے کر رکھا تھا اور بعض اخباروں سے ماہانہ رقم وصول کی جاتی تھی۔ یہ ساری رقم مل کر اتنی نہیں ہوتی تھی کہ ایجنسی کے اخراجات پورے ہو سکتے۔ جو کمی رہ جاتی تھی وہ گرانٹ سے پوری کر لی جاتی تھی۔

ایجنسی کے ایڈیٹر انچارج عثمان صدیقی ٹھاٹھ کرتے تھے۔ مسٹر کولز کو وہ باس کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ جتنے عرصے تک میں نے وہاں کام کیا میں نے دو ایک بار ہی ان کی زبان سے کولز کا نام سُنا ہوگا۔ ورنہ ہمیشہ باس ہی سنا۔ گفتگو کے وہ ماہر تھے اپنے مخاطب کو چٹکی بجاتے میں شیشے میں اُتار لینے کا فن اُنہیں خوب آتا تھا۔ پنجابی سوداگر برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سیٹھ عبدالخالق عبدالرزاق کے داماد ہیں۔ اور آجکل آسٹریلیا کے اخبار "ملبورن ہیرالڈ" میں کام کرتے ہیں۔ اسٹار میں ایڈیٹری کے دوران میں بھی وہ اس اخبار کی نامہ نگاری کرتے تھے۔ وہاں سے بھتّہ انہیں الگ ملتا تھا۔ انہیں یہ زعم تھا اور شاید اب بھی ہو کہ ان سے بہتر انگریزی پاکستانی صحافیوں میں نہ کوئی بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے۔

بیئر بہت پیتے تھے۔ سردیوں میں بھی بیئر نہیں چھوڑتے تھے۔ پتہ نہیں ملبورن میں بھی ان کا یہ چلن ہے یا نہیں۔ وہ اکثر چپراسیوں اور ٹائپسٹوں سے پاکستان کی سیاست پر گفتگو کرتے تھے۔ اور پھر سفارت خانوں کی پارٹیوں میں اعلےٰ طبقہ کے لوگوں کے خیالات معلوم کر کے خود ایک نتیجہ قائم کرتے تھے یہی غیر ملکی اخباروں کے لئے ان کے نیوز لیٹر کا موضوع بنتا تھا۔ اور ان اخباروں کی پالیسی کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ کولز اپنے باس کو وہ اوّل نمبر کا کنجوس کہتے تھے۔ کیونکہ کولز دفتر میں پی جانے والی کافی اور چائے کے بڑھتے ہوئے اخراجات پر اکثر بھُن بھُن کیا کرتے تھے۔ اس پر دونوں میں جھڑپ بھی ہو جایا کرتی تھی اور وہ جھوٹ موٹ رُوٹھ کر کافی پینا چھوڑ دیتے تھے۔ عثمان صاحب کی یہ ستیہ گرہ کامیاب رہتی تھی۔ اور مسٹر کولز خود ہی کسی روز اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر اُن کی میز پر رکھ آتے تھے۔ اور پھر دونوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ دوسرے دن سے عثمان صدیقی پھر دھڑلے سے کافی خرچ کرنے لگتے تھے۔ جب مسز کولز دفتر کا حساب کتاب کرنے بیٹھتیں تو بہت ناک بھوں چڑھایا کرتی تھیں۔ واقعی دونوں طبیعت کے بنیئے تھے۔

اس ایجنسی میں رات کو گیارہ بجے تک ریڈیو سے خبریں مانیٹر کی جاتی تھیں۔ رات کو ایک بلیٹن انگریزی اخباروں کو جاری ہو جاتا تھا۔ کم اہم خبریں دن کے لئے چھوڑ دی جاتی تھیں۔ جن کے انگریزی اور اُردو اسٹینسل تیار ہوتے تھے۔ اور ایک ہفتہ پُرانے نیوز لیٹر جو مسز کولز کے نام لندن کے وسائل سے موصول ہوتے تھے۔ وہ بھی تازہ خبروں کی صورت میں اسٹینسل میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ بھلا بھیڑوں کے اُون میں اضافہ کی خبر کبھی باسی ہو سکتی ہے؟

ایسی ہی خبروں کا اور فیچروں کا ترجمہ مجھے اسٹینسل پر لکھو دینا پڑتا تھا۔ انگوٹھے اور دو انگلیوں پر گٹّے پڑ گئے تھے۔ یہ عذاب کبھی جھیلا نہیں تھا۔ شروع شروع میں بڑی وحشت ہوتی۔ انگلیوں میں سخت درد ہوتا تھا۔ اور جب شام کو امروز میں خبروں کے ترجمہ کے لئے قلم پکڑنا پڑتا تھا تو انگلیاں پھوڑے کی طرح دُکھتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ عادت پڑ گئی۔ اسٹینسل کے فولادی قلم پر بھی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اور گٹّے دار انگلیاں بھی عادی ہو گئیں۔ پندرہ پندرہ اسٹینسل روز کاٹنے پڑتے تھے۔ ایک تو خبریں انتہائی بے مزہ اور غیر دلچسپ اور پھر ان کا اسٹینسل پر ترجمہ یہ سارا عمل اس قدر اُکتا دینے والا ہوتا تھا کہ بعض اوقات تو یہ جی چاہتا تھا کہ اس دو سو روپے کی نوکری پر لات مار کر امروز ہی کی ۲۲۰ روپے کی ملازمت پر قناعت کر لی جائے۔ مگر جب مہینہ ختم ہونے پر دونوں جگہ سے کل ۴۲۰ روپے کی رقم ملتی تھی تو ۴۲۰ کے عدد پر ہنسی بھی آتی تھی۔ اور آئندہ ماہ پھر اسی طرح کام کرنے کی امنگ اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔ بس اس امنگ کے سہارے ڈیڑھ سال تک چودہ پندرہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا۔ یہ اپنے وجود کے ساتھ بڑی زیادتی تھی۔ مگر یہی زیادتی آگے چل کر بہت کام آئی۔ ترجمہ کی رفتار بڑھ گئی اور سرخیاں جمانے کا سلیقہ آ گیا۔ سال پُورا ہونے کے بعد عثمان صدیقی نے میرا شوق، محنت اور وقت کی پابندی دیکھ کر تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر دیا۔ مجھ سے پہلے جو صاحب کام کرتے تھے ان کی تنخواہ تین سو روپے تھی۔ امروز میں تنخواہ بڑھنے کا سوال "بند" ہوتا تھا۔ کیونکہ میں وہاں لیو ویکینسی پر کام کر رہا تھا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب ری پبلکن پارٹی کی حکومت

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

تربیلا ڈیم

غیر ملکی کمپنی مزدوروں کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنا رہی ہے

سلطان احمد

تربیلا ڈیم ایک عظیم منصوبہ ہے۔ لیکن اس منصوبہ کے معماروں کے ساتھ یہاں پر کام کرنے والی غیر ملکی کمپنی کا رویہ انتہائی سفاکانہ اور غیر انسانی ہے کمپنی نے جس طرح مقامی سول انتظامیہ سے مل کر مزدوروں کی نمائندہ یونین کو ختم کر دیا اور مزدور یونین کے جنرل سیکرٹری محمد انور خان ابھی تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے۔ یونین کو ٹھکانے لگانے کے بعد کمپنی کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اور صرف فروری ۱۹۷۰ء کی ہڑتال میں جو کمپنی نے خود کرائی تھی۔ تقریباً ۱۳ سو مزدوروں کو انتقامی کاروائی کے طور پر ملازمتوں سے برطرف کیا گیا۔ وہ لوگ آج تک بے روزگار رہیں۔

۱۶ جولائی کو تربیلا جائنٹ وینچر کی سروے سیکشن کے چند انسٹرومنٹ مینوں نے جن کو انسٹرومنٹ مین کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا تھا۔ مگر کام سروئیر کا لیا جاتا تھا۔ اور جن کی مدت ملازمت بھی دو سال سے کسی طور پر کم نہ تھی۔ کمپنی سے مطالبہ کیا کہ اُن کو سروئیر کا گریڈ دیا جائے یا ان سے انسٹرومنٹ مین کا کام لیا جائے لیکن کمپنی نے ان کے مطالبے پر غور کرنے کی بجائے انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اس پر ان کے باقی تیس ساتھیوں نے احتجاج کیا۔ جس پر کمپنی نے ان کو بھی ڈسچارج کر دیا۔ جن آدمیوں کو ڈسچارج کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں محمد عنائیت ملک بیج نمبر ۶۹۲۷، ظہور احمد بیج نمبر ۶۵۲۲، عزیز الرحیم نمبر ۷۱۸۰، عنایت محمد بیج نمبر ۶۴۲۶، محمد یعقوب بیج نمبر ۶۰۸۴۹، عبدالستار بیج نمبر ۶۶۵۲۰، جہانگیر ۷۰۳۶، عبدالغفور ۶۶۳۸۰، افضل عابد بیج نمبر ۷۸۶۲، بشیر افضل بیج نمبر ۷۰۸۶۱، امیر زادہ، منور حسین، صدیقی، لال خان بیج نمبر ۷۲۶، عبدالحمید محمد یوسف بیج نمبر ۷۶۷۰، محمد رمضان، یوسف علی بیج نمبر ۶۵۲۳، باقر حسین نور حسین بیج نمبر ۷۲۶۸، محمد یعقوب عبدالمجید قریشی بیج نمبر ۶۹۳۰، محبوب بیج نمبر ۶۵۲۴، مصطفےٰ احمد نصیر بیج نمبر ۷۰۳۴، محمد رشید ۷۶۹۹، کمال۔ مبارک حسین عبدالمجید ملک نمبر ۷۰۶۴، عالم خان، محمد انور ان لوگوں نے ملازمت پر دوبارہ بحالی کے لئے حکومت کے درج ذیل ذمہ دار افسران کو درخواستیں دی ہیں۔ گورنر صوبہ سرحد (۲) سیکرٹری لیبر ویلفیئر صوبہ سرحد (۳) لیبر ڈائرکٹر لیبر ویلفیئر پشاور (۴) ڈی سی ہزارہ (۵) لیبر افسر محکمہ محنت صوبہ سرحد واپڈا کالونی۔

یہ تو ڈیم کے صرف ایک شعبے کا ذکر تھا۔ اب آئیے ذرا دوسرے شعبوں کو بھی دیکھ لیں۔ ان دنوں کمپنی چھانٹی کا بہانہ بنا کر ورکشاپ کنویئر سیکشن ارتھ موونگ سیکشن، ٹرانسپورٹ کنکریٹ غرض کہ تمام شعبوں سے پرانے مزدوروں کو نکال کر کم تنخواہ پر نئے لوگوں کو بھرتی کر رہی پچھلے دنوں ٹرانسپورٹ سیکشن کے انچارج نے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگایا تھا۔ کہ کسی مزدور کو چھٹی نہیں ملے گی۔ خواہ اس کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار یا عزیز مر جائے۔ جب بھی چھٹی نہیں ملے گی۔ اس طرح کئی مزدور برطرف کئے گئے اور بہت سے ملازمین کو چارج شیٹیں دی گئیں مزدوروں کے خلاف تمام گھناؤنی کاروائی پر پردہ ڈالنے کے لئے کمپنی نے مقامی انتظامیہ کو خرید نے کے علاوہ ڈیم کے اندر ایک لیبر ویلفیئر کا شعبہ بھی قائم کیا ہے۔ جس کو چلانے کے لئے ایک شخص صاحبزادہ محمود خان کو لیبر ویلفیئر افسر رکھا گیا ہے۔ موصوف ویلفیئر افسر کم ہیں۔ اگر کسی مزدور کا کیس مذکورہ لیبر ویلفیئر افسر کے پاس چلا جائے تو یہ صاحب اس کو دس بارہ دن اپنے دفتر کے چکر کٹوانے کے بعد ڈسچارج سلپ دے دیتے ہیں اور اگر ایک آدھ کیس کا فیصلہ کسی مزدور کے حق میں ہو جاتا ہے۔ تو ان صاحب میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس پر عمل درآمد کرا سکیں۔ اس کی تازہ مثال قادر شاہ ڈرائیور ہے۔ جس کا فیصلہ اس کے حق میں کیا گیا۔ لیکن اس کے سیکشن انچارج نے اُسے ڈیوٹی پر لینے سے انکار کر دیا اور وہ آج تک دفتروں کے چکر کاٹ رہا ہے اس وقت ڈیم کے مزدوروں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا راج ہے۔ کیونکہ مقامی انتظامیہ اور کمپنی کی سی آئی ڈی مختلف طریقے سے مزدوروں کو تنگ کر رہی ہے اس لئے ڈیم کے مزدوروں کا یہ مطالبہ ہے کہ کمپنی یونین کے ساتھ جنوری ۱۹۷۰ء میں کئے گئے معاہدے کی پابندی کرے اور مزدوروں کے باشعور رہنما اور یونین کے جنرل سیکرٹری محمد انور خان کو رہا کیا جائے۔

ڈیرہ غازیخان

یہاں صحت نہیں بیماریاں ملتی ہیں

محمد حنیف درانی

ڈیرہ غازی خان کو پاکستان کا ایک ضلع ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس پسماندہ علاقے کے انسانوں کو بھی داگر واقعی ان کی زبوں حالی انہیں ایسا انسان ثابت کرتی ہے) از راہ کرم انسان سمجھتے ہوئے ان کی صحت کے تحفظ اور علاج معالجہ کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ایک ہسپتال موجود ہے بلکہ اس ہسپتال کو ضلعی ہیڈ کوارٹر ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

بظاہر تو یہ ہسپتال عوامی صحت کے تحفظ کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ مگر اپنے آقاؤں کی کرشمہ سازی اور کمال آئی کو کیا کہیئے کہ اس ہسپتال میں صحت اور صحت سے متعلق ادویات کے علاوہ ہر چیز ملتی ہے۔

جی ہاں حیران ہونے کی ضرورت نہیں! یہ ہمارے ملک کے صاحبان فن کی ہنر مندی اور کرشمہ گری کا زندہ ثبوت ہے۔ ہسپتال کے ساتھ اگر ادویات کا تصوّر بھی آپ کے ذہن کے کسی گوشہ میں جاگ اٹھتا ہے تو یہ آپ کا اپنا قصور ہے وگرنہ ہمارا ہسپتال اس تکلف سے قطعاً مبرا ہے۔ یہ تو جانے کس دور اور کس دیس کی بات ہے کہ نادار و مفلس مریضوں کو ہسپتال سے ادویات بھی مہیا کی جائیں۔

ع ہر چند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے

اب زمانہ ترقی کر چکا ہے آخر میڈیکل سٹورز کس لئے ہیں ؟ اور اگر آپ اتنے ہی نادار ہیں کہ گراں قیمت ادویات خریدنے کی ہمت نہیں رکھتے تو بھلا بیمار پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ ہاں اگر آپ متمول صاحب حیثیت ہیں تو آپ کو ہسپتال سے ادویات مہیا ہو سکتی ہیں ۔ مگر

اہل زر آئیں تو سینے سے لگا لیتے ہیں لوگ

اس حسین روائیت کو ڈیرہ غازیخان کا ہسپتال اور اس کا عالی ظرف عملہ بڑی خوبی سے نبھا رہا ہے ڈاکٹر دین محمد درانی کی بیوی بیمار ہو تو تمام ہسپتال لرز جائے اور خیر دین یا لعل خاں آئے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ۔ ادویات میں آمیزش آب تو روش عام ہے اور ہمارے ڈاکٹروں کی انسانی ہمدردی کے وسیع و رفیع جذبات کی مظہر و ثبوت ، خالص ادویات ہمارے فاقہ کش عوام کی بیماریوں کی قاتل ثابت ہو سکتی ہیں ۔ او بھلا ہمارے جذبۂ انسانیت اور ہمدردی و شفقت سے سرشار معالج ایسا کر کے ان کو "دارالمحن" کرۂ ہست و بود میں تا دیر محبوس رکھنا کیسے پسند کر سکتے ہیں ۔

"صفائی اور تندرستی کا چولی دامن کا ساتھ ہے" ۔ جانے یہ مقولہ کس صاحب جنون کا ہے اہل دور خرد میں ایسے غلط اصولوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں صحت کے اصولوں اور طبی نقطۂ نظر سے گندگی بے شک مضر صحت ہو گی ۔ مگر ہمارے معالجوں کے نظریات کے مطابق گندگی افزائش صحت کے لئے امر لازم ہے جبھی تو ہسپتال میں گندگی کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے ۔ جا بجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر صحت عامہ کی خدمت کرتے نظر آتے ہیں ذرا ایک مرتبہ ہسپتال کے کسی وارڈ میں چلے جائیے اگر مارے بدبو کے دماغ نہ پھٹنے لگے تو ہم آپ کی سخت جانی کے قائل ہو جائینگے

کسی غریب مریض سے خوش گفتاری اور خوش کلامی دور رفتہ کے معالج لا بدی سمجھتے ہوں گے ۔ مگر آج یہ امر باعث عار اور کسر وقار ہے بھلا کسی نادار و مفلس آدمی سے ہنس کر اور خوش اخلاقی سے بات کرنا کسر شان نہیں ؟ ویسے بھی اس مخلوق کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیئے ۔ لیکن اگر تہذیب و اخلاق سے بیر و تعصب اسی حد تک ہو تو گوارہ بھی ہو سکتا ہے ۔ مگر بھلا ڈیرہ غازیخان کے عالی ہمت ارکان عملۂ ہسپتال اسی پہ اکتفا تھوڑا کرتے ہیں ۔ بلکہ بوقت ضرورت بہ دست عزت افزائی کرنے سے بھی نہیں چوکتے ۔

حبیب اللہ طارق ایک طالب علم ہے شومئی قسمت وہ اپنی ہمشیرہ کو ہسپتال لے آیا ۔ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کی عدم موجودگی کے باعث وہ ہمشیرہ کو ہسپتال سے باہر ایک پلاٹ میں لے گیا اور انتظار کی طویل گھڑیاں گن کر کیفیت اجل سے آشنا ہونے لگا ۔ مگر بھلا ہسپتال کا فرض شناس عملہ کسی کو مصیبت میں کب دیکھ سکتا ہے ۔ چنانچہ ڈسپنسر غلام عباس نے اپنے مسموم اور کج فہم ذہن کے باعث حبیب اللہ اور ان کی ہمشیرہ کو غلط کار سمجھتے ہوئے بلا تحقیق ان پر حملہ کر دیا اور چند احباب کی مدد سے حبیب اللہ کو زدوکوب کیا ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر خطا کار ضمیر کی طرح انہوں نے بھی بزدلی کا مظاہرہ کیا اور حبیب اللہ کو آمادہ انتقام دیکھ کر معافی کے لئے گڑگڑانے لگے ۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ دوسروں کو درس اخلاق و تہذیب اور سبق شرافت سکھانے والے خود اخلاقی پستیوں کی ان گہرائیوں میں جاگزین ہیں جہاں دیکھنے سے بھی احساس کراہیت ہو ۔

رشوت ستانی اگرچہ تمام معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے ۔ مگر ہسپتال میں یہ مرض ایک لعنت کی طرح سوار ہے ۔ افسر اعلٰی سے لے کر ادنٰی اہل کار تک اس مصیبت کی دلدل میں غرق نظر آتے ہیں ۔ ابھی چند روز ہوئے چند آدمی زخمی ہو کر آئے حسب منشا رپورٹ دینے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے زخمی عبدالکریم کے ورثا سے ۱۰۰ روپیہ طلب کیا اور نذرانہ وصول کر کے رپورٹ تیار کی ۔

غلام نبی ایک وارڈ سرونٹ ہے مگر صرف کاغذات کی حد تک وگرنہ یہ صاحب ایم ایس صاحب کے گھر کا فرنیچر تیار کرنے پر مامور ہیں ۔ تنخواہ البتہ حکومت سے وارڈ سرونٹ کی وصول کرتے ہیں ۔

اللہ یار ایک چپراسی ہے مگر تمام دن ایم ایس صاحب کے باورچی خانہ میں بطور باورچی کام کرتا ہے ۔

کیا یہ باتیں بدعنوانی کے زمرے میں نہیں آتیں ۔ یہ تمام بدعنوانیاں دھڑے سے کی جا رہی ہیں اور کوئی احتساب نہیں کرتا شاید سرخ فیتے کا ہاتھ ہو عملہ کی کوتاہی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو ہسپتال میں جس قدر خوانچہ فروش آتے ہیں ۔ تمام گلے سڑے پھل فروخت کرتے ہیں ۔ مگر ہسپتال کے عملہ کے کان پر جوں نہیں رینگتی ۔ شاید وہ اپنا حق وصول کر چکے ہوتے ہیں ہسپتال کی عمارت میں جراثیمی اشیاء کی فروخت بوالعجبی کی حیرت انگیز مثال ہے ۔



قارئین کہتے ہیں

الفتح کے سالنامے کا جتنی شدت سے انتظار تھا اتنا ہی پرچہ "بے مثال" نکلا۔ کاغذ کی ہوشربا گرانی، دگرگوں حالات اور وسائل کی کمی کے باوجود اتنا معیاری جامع اور جاذبیت سے بھرپور پرچہ نکالنا واقعی ایک کارنامہ ہے اور آپ کی کاوش کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے!

ہامان اور قارون کی نسل ۲۳ خاندانوں تک جا پہنچی ہے

قائد عوام کا انشائیہ واقعی ایک شہ پارہ ہے جس کے بین السطور میں ان کی ژرف نگاہی بصیرت اور دوربینی جھلکتی ہے "صحافت کا ایک سال" قومی مفاد اور سرمایہ دار "خس کم جہاں پاک" "تختی" اور بائیس خاندان لاریب خاصے کے مضامین ہیں ۲۲ خاندانوں کے سلسلہ میں آپ کا تجزیہ کچھ نامکمل سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ پچھلے سال نصرت میں شبلی صاحب نے جن خانوادوں سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ ان میں سے آپ نے ابراہیم رحمت اللہ، فیروز سنز، رانا فیملی، فقیر فیملی، جنرل حبیب اللہ مائر، نون، ہوتی، دولتانہ، پراچہ اور مستوں کو حذف کر دیا ہے۔ بیشک آپ نے کالونی کے دو اور کچھ دوسرے "چھپے رستم" خاندانوں سے بھی ہمارا تعارف کرا دیا ہے۔ اس طرح ایک بات اور واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان میں "ہامان" اور "قارون" کی نسل ۲۲ نہیں بلکہ ۳۳ یا اس سے بھی زیادہ خاندانوں تک جا پہنچی ہے۔

چونکہ محولہ بالا خاندانوں کی بے سروسامانی اور "اثاثہ" بھی آپ کے متذکرہ ۲۲ خاندانوں سے کسی طرح کم نہیں اس لئے آئندہ کسی اشاعت میں ان کا بھی "نقد و نظر" کر دیجئے گا! تاکہ ایک تو ہماری معلومات میں اضافہ ہو اور "مکافات عمل" کے وقت پاکستانی عوام کے "مہربانوں" میں سے کوئی بھی محروم التفات نہ رہے، ان کے اسمائے گرامی دمن حیث الجماعت اسے ہر پاکستانی کی آشنائی از حد ضروری ہے

اکرم سرحدی - اسلام آباد

رشوت دو گے تو

پاسپورٹ بنے گا

مورخہ ۲۲/۴/۷۱ کو مسمات بڈھی۔ مسمات بانو اور منو کے پاسپورٹ کے کاغذات کیس نمبر ۴۰۷۰- ۳- ۴۷۰- ۵- ۷۵۵ ۴ ایران عراق اور شام کے مقدس مقامات کی زیارتوں کے لئے ریجنل پاسپورٹ آفس حیدر آباد میں جمع کرائے گئے۔ کاغذات کے ساتھ مسلم کمرشل بینک کی مذکورہ ممالک کے لئے دو سو پچاس روپے کی بینک گرانٹی بھی شامل تھی پاسپورٹ کے کاغذات جمع کرنے وقت اس بنک گرانٹی کو درست تسلیم کرتے ہوئے کاغذات جمع کئے گئے کاغذات جمع کرانے کے بعد جب میں مقررہ تاریخ کو پاسپورٹ لینے کے لیے متعلقہ کلرک کے پاس گیا تو اس نے فی پاسپورٹ تین سو روپے بطور رشوت مانگے۔ رشوت نہ دینے کی وجہ سے کہا گیا کہ یہ بنک گرانٹی نامکمل ہے اور کہا کہ بارہ سو روپے کی بنک گرانٹی لاؤ۔ جب کہ حکومت پاکستان کی ان تینوں ملکوں کے مقامات کے سلسلے میں خاص ہدایات ہیں۔ جب میں یہ شکایت لیکر پاسپورٹ آفیسر کے پاس گیا تو اس نے میری شکایت پر کوئی غور نہیں کیا۔ الٹا کلرک کے کہنے پر مجھے ڈانٹنے لگا اور کہا کہ "ہم اپنے حکام بالا سے اس بات کی وضاحت کریں گے بعد میں دیکھا جائے گا۔" مزے کی بات تو یہ ہے کہ کراچی حیدر آباد سے نوے میل کے فاصلے پر ہے اور چار ماہ گذرنے کے بعد بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ ہے پاسپورٹ آفس کی کارکردگی جب میں مایوس ہو کر جانے لگا تو کلرکوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا کہ "بڑا آیا ہے پاسپورٹ لینے والا" اور کہا کہ "جب تک رشوت نہ دو گے پاسپورٹ نہیں بن سکتا۔"

پاسپورٹ آفس میں جو اندھیر ہے اس کی داستان بہت لمبی ہے دور دراز سے آنے والے عوام کو اس طرح پریشان کیا جاتا ہے کہ وہ بیچارے روتے ہوئے جاتے ہیں۔

(امان اللہ سومرو۔ نیو ٹاؤن میرپور خاص)

ماں اپنے بچے کی

صورت کو ترستی ہے

کراچی کے اسپتالوں میں واقعی ظلم ہو رہا ہے۔ میری بہن اسپتال میں داخل ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ اسپتال والوں نے یہ قانون بنا رکھا ہے کہ اسپتال میں بچے نہیں رہ سکتے۔ کتنا بڑا ظلم ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کی صورت سے ترستی ہے بچے کو اندر نہیں آنے دیتے۔ اس حالت میں میری بہن کیا اچھی ہو سکتی ہے۔؟ میری بہن کیا۔ اور بھی سینکڑوں مائیں نہیں ہیں جن کو علاج سے زیادہ اپنے بچوں کا غم ہوتا ہے اور جب غم ہوتا ہے تو کوئی علاج کام نہیں آتا۔ آخر یہ ظلم کب تک چلے گا؟

(ایک شہری - کراچی)

پھانسی گھر سے ایک خط

صفحہ ۱۴ سے آگے

جناب صدر۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا مجرم پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے ایسی عبرت ناک، دہشت ناک، افسوسناک اور سخت ترین جگہ پر کتنا عرصہ رہتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی موت پانے والے کی قسمت کا ہاتھ ہے چونکہ فیصلہ ہو جانے کے بعد اسے اپیلوں کا حق حاصل ہوتا ہے۔ سیشن جج کے فیصلہ کے خلاف پہلے ہائی کورٹ میں پھر سپریم کورٹ میں پھر گورنر صاحب اور آخر میں صدر صاحب کے پاس رحم کی اپیل کی جاتی ہے میرے خیال میں اگر کوئی موت پانے والا کسی سٹیج پر رعایت کا حقدار نہیں سمجھا جاتا ہے تو کم از کم ایسی تنگی میں اسے دو سال کا عرصہ ضرور لگ جاتا ہے۔ اس عرصہ میں ہر دم موت کا سایہ الگ رہتا ہے۔

صدر محترم! ساری صورت حال آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ آپ خود اندازہ فرمالیں ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ ایک ایسا شخص جس کو "موت کی سزا" کا حکم سنایا جا چکا ہو۔ پھر اسے دو سال تک ایسی اذیت ناک حالت میں رکھنے کا مطلب؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ پھانسی پانے والا کہیں فرار نہ ہو جائے یا خودکشی نہ کرے۔

صدر محترم۔ آپ غور فرمائیں۔ ان ہر دو کاموں کے لئے انسانی نیت ہی کا عمل دخل ہوتا ہے جب نیت ہی میں خلل آجائے تو پھر دنیا کی کوئی بندش یا کوئی پہرہ اس آدمی کو "کر گذرنے" سے باز نہیں رکھ سکتا۔ جنہیں فرار ہونا ہوتا ہے۔ وہ ضرور ہو جاتے ہیں دلائل پور جیل سے پھانسی پانے والے ہی فرار ہوئے تھے، جنہیں خودکشی کرنا ہوتی ہے۔ وہ کسی کپڑے کو باندھ کر بھی اس میں لٹک جاتے ہیں یا آہنی دروازے کے ساتھ سر ٹکرا کر مر جاتے ہیں ایسی مثالیں وجود میں آچکی ہیں۔

صدر محترم! ہونا تو یہ چاہیئے کہ جس انسان کی موت کا وقت معین اور مقرر ہو چکا ہے۔ پھر اس کے ساتھ سختی کا ہے کو، بلکہ اسے تو زیادہ سے زیادہ دنیاوی سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ اس کے سامنے تو خدا تعالیٰ کی ارض کی عطا کردہ نعمتوں کے ڈھیر لگے ہونے چاہیئے۔

جناب صدر! آخر یہ لوگ بھی کسی ماں کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ کسی باپ کے لخت جگر ہیں۔ کسی کا سہاگ ہیں اور کسی کے بھائی ہیں۔ اور کسی کے خود باپ ہیں جب تک زندہ رہیں۔ ان پر عام حالت سے کچھ زیادہ ہی ترس کھایا جائے۔ ان کی عزت کی جاتے۔ کیونکہ یہ تو دنیا میں ہی اپنے برے فعل کا بدلہ دے کر اگلے جہاں میں سرخروئی حاصل کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے تو اس دنیا میں ہی خمیازہ بھگت لیا اور حق ادا کر دیا۔ ان سے بڑھ کر قانون کا پاسبان اور احترام کرنے والا اور کون ہے (آپ خود ہی اندازہ لگالیں)

صدر محترم! آخر میں بندہ ان جیسے ہزار ہا پھانسی چڑھنے والوں کے نام پر اور خصوصاً انسانیت کے نام پر یہ گذارش کرے گا۔ کہ ان پر جو انگریزوں کے بنائے ہوئے قانون (جیل مینوئل) کی وجہ سے اتنی بے شمار سختیاں اور پابندیاں ہیں۔ ان میں لچک پیدا کی جاوے۔ خصوصی رعائیت اس وجہ سے ہی دی جائے کہ یہ لوگ اس دُنیا میں چند دن کے مہمان ہیں اور خاص کر انہیں کھانے پینے کی کھلی اجازت دینی چاہیئے (جیل کا کھانا کوئی خاص سٹینڈرڈ کا نہیں ہوتا) اور دن کے وقت ان کو کھلے آسمان تلے دیکھیوں سے باہر بالبغیر ہتھکڑیوں کے رکھا جائے۔ جناب والا جب بارک کا مین گیٹ بند ہوتا ہے اور پارک کے اندر چار سرکاری ملازم اور چار قیدی نمبرداران کی کڑی نگرانی ہوتی ہے تو ایسی صورت حال میں صاحب صدر یقین جانئے فراری کا ذرا بھر احتمال نہیں ہے۔ اور یوں دن دہاڑے فراری بھی نہیں ہوا کرتی ہے۔

صدر محترم۔ یہ سب پابندیاں اور بندشیں محض رواجی چلی آرہی ہیں۔ لکیر کے فقیر کے مترادف قانون پر عمل ہو رہا ہے۔ جب بھی ذرا عقل انسانی سے کام لیا جائے گا تو حقیقت اور ہی نظر آئے گی پھر یہ سب غیر انسانی اور غیر فطری قوانین اک مذاق سے کم نظر نہ آئیں گے۔

صدر محترم مجھے کامل امید ہے کہ آپ میری ان گذارشات کو اپنے دل میں جگہ دیں گے اور ہمدردانہ غور فرماتے ہوئے ان غریب سزائے موت پانے والوں پر رحم و ترس کھا کر نئے احکام جاری فرمائینگے آپکو بہت ثواب ہوگا۔ لاکھوں دعائیں ملیں گی انشاءاللہ

تابعدار ایک قیدی

بقیہ:- روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک

تھی اور ملک فیروز خان نون وزیر اعظم تھے۔ کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ میں اس کے پاس جاؤں اور "غالب" میں انہوں نے جو چار مہینوں کی تنخواہ ہتھیالی تھی اس کا مطالبہ کروں۔ مگر یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ وہ اب مجھے کیا پہچانیں گے۔ اس وقت پاکستان میں کچھ ایسی ہوا چل رہی تھی کہ وزیر اعظم تو وزیر اعظم کوئی شخص خالی وزیر بے قلمدان ہی بن جاتا تھا۔ تو اپنے قریبی عزیزوں کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا تھا۔ ویسے بھی وزارتیں ٹپکے کا آم بنی ہوئی تھیں۔ رات کو اچھا خاصا آدمی سوتا تھا۔ صبح آنکھ کھولتا تھا تو اپنے سر پہ تاج وزارت جگمگاتا دیکھتا تھا۔ اسٹار نیوز ایجنسی پاکستان کے اس وقت کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات پر خصوصی رپورٹ تیار کرکے ہائی کمیشن کو بھیجتی تھی۔ جہاں سے ترمیم و اضافہ کے بعد یہ رپورٹ برطانوی حکومت کو بھیجی جاتی تھی۔ ہر سفارت خانہ یہی کچھ کرتا ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز یا انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایک نجی خبر رساں ادارے کا یہ کام انجام دینا البتہ نئی بات تھی۔ یہ بات تو سمجھ میں آنے والی نہیں کہ اس ایجنسی کی اس قسم کی سرگرمیوں پہ حکومتِ وقت کی نظر نہیں تھی۔ اور اس کے علم و اطلاع کے بغیر یہ کارروائی ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لار کے بعد بھی جاری رہا۔ خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، چندریگر، سہروردی کی وزارتیں بڑی تیزی سے گرتی رہیں۔ فیروز خاں نون کی وزارت عظمیٰ نئی سیاسی جماعت کے سہارے مضبوطی سے جمانے کی اسکندر مرزا نے بہت کوشش کی۔ وہ اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف اندر ہی اندر ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بس یہ لگتا تھا پاکستان اب گیا۔ اب گیا۔ مگر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لار نافذ کرکے ایوب خاں نے جو پہلے جنرل تھے بعد میں فیلڈ مارشل بنے "پاکستان کو بچا لیا" اور دس سال تک اس انداز سے بچائے رکھا کہ کسی سیاسی شورش نے سر نہ اٹھایا۔ لیکن ہر کمالے را زوالے کے مصداق آمریت کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہو کر رہی یا "مارشل لا" کی خبر کس طرح آئی اور اخبارات نے اسے کس طرح چھاپا اس کی تفصیل آئندہ مضمون میں بیان ہوگی۔ (باقی آئندہ)

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
26, AUGUST – 2, SEPT. 1971

پاکستان کی قومی جنگ ۱۹۶۵ء

کے جذبے کو تازہ رکھنے کیلئے ہفت روزہ الفتح کراچی آئندہ ہفتے

اشاعتِ خاص پیش کر رہا ہے

مندرجات

* پاکستان کی قومی جنگ اور پاکستان کے عوام
* بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم
* پاکستانی عوام کے لئے چین کی لازوال حمایت کی داستان
* امریکہ برطانیہ اور روس کی سازشیں
* تاشقند کا المیہ اور کشمیر کا مسئلہ
* سلامتی کونسل میں بھٹو کی یادگار تقریر کا متن (قندِ مکرّر)
* ۱۵ اگست سے ۱۰ جنوری تک ۔ جہادِ کشمیر سے تاشقند کے المیہ تک خبروں کا انتخاب

اشاعتِ خاص کا سرورق : ۷ رنگوں میں
پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کے انٹرویو کے ساتھ آرٹ پیپر پر سات رنگوں میں تصویر
(اسے فریم بھی کرایا جاسکتا ہے)
ضخامت :- معمول سے کہیں زیادہ
قیمت :- ایک روپیہ

جنگِ ستمبر کے بارے میں
ذوالفقار علی بھٹو کا انٹرویو

ایجنٹ حضرات

فوری طور پر اپنی منسوبہ تعداد سے آگاہ فرما دیں [illegible] لنامے کے آرڈر تاخیر سے ملنے کی صورت میں ادارہ پوری تعداد میں پرچے [illegible] نہیں کر سکتا تھا۔

مشتہرین حضرات ۲۸ اگست [illegible] اشتہارات بھیج سکتے ہیں۔

(جنرل مینیجر)